دوسرا خطبہ

وَمِنْ خُطْبَةٍ لَهُ (عَلَيْهِ السَّلَامُ)
بَعْدَ انْصِرَافِهِ مِنْ صِفِّيْنَ وَ فِيْهَا حَالُ النَّاسِ قَبْلَ الْبِعْثَةِ وَصِفَةُ آلِ النَّبِيِّ (صَلَى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ) ثُمَّ صِفَةُ قَوْمٍ آخَرِيْنَ

،جس میں بعثت پیغمبرؐ کے وقت لوگوں کے حالات اور آل رسول علیہم السلام کے اوصاف اور دوسرے افراد کی کیفیات کا ذکر ہے۔

حصّہ اوّل

صفین سے واپسی پر آپ علیہ السلام نے فرمایا:

أَحْمَدُهُ اسْتِتْمَامًا لِنِعْمَتِهِ وَ اسْتِسْلَامًا لِعِزَّتِهِ وَ اسْتِعْصَامًا مِنْ مَعْصِيَتِهِ وَ أَسْتَعِيْنُهُ فَاقَةً إِلَى كِفَايَتِهِ إِنَّهُ لَا يَضِلُّ مَنْ هَدَاهُ وَلَا يَئِلُ مَنْ عَادَاهُ وَلَا يَفْتَقِرُ مَنْ كَفَاهُ فَإِنَّهُ أَرْجَحُ مَا وُزِنَ وَ أَفْضَلُ مَا خُزِنَ وَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ شَهَادَةً مُمْتَحَنًا إِخْلَاصُهَا مُعْتَقَدًا مُصَاصُهَا نَتَمَسَّكُ بِهَا أَبَدًا مَا أَبْقَانَا وَ نَدَّخِرُهَا لِأَهَاوِيْلَ مَا يَلْقَانَا فَإِنَّهَا عَزِيْمَةُ الْإِيْمَانِ وَ فَاتِحَةُ الْإِحْسَانِ وَ مَرْضَاةُ الرَّحْمٰنِ وَ مَدْحَرَةُ الشَّيْطَانِ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَ رَسُوْلُهُ أَرْسَلَهُ بِالدِّيْنِ الْمَشْهُوْرِ وَ الْعَلَمِ الْمَأْثُوْرِ- وَ الْكِتَابِ الْمَسْطُوْرِ وَ النُّوْرِ السَّاطِعِ وَ الضِّيَاءِ اللَّامِعِ وَ الْأَمْرِ الصَّادِعِ إِزَاحَةً لِلشُّبُهَاتِ وَ احْتِجَاجًا بِالْبَيِّنَاتِ وَ تَحْذِيرًا بِالْآيَاتِ وَ تَخْوِيْفًا بِالْمَثُلَاتِ.

’’پروردگار کی حمد کرتا ہوں، اس کی نعمتوں کی تکمیل کے لیے اور اس کی عزت کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے، میں اس کی نافرمانی سے تحفظ چاہتا ہوں اور اس سے مدد مانگتا ہوں کہ میں اسی کی کفایت و کفالت کا محتاج رہوں، وہ جسے ہدایت دیدے وہ گمراہ نہیں ہوسکتا ہے اور جس کا وہ دشمن ہوجائے اسے کہیں پناہ نہیں مل سکتی ہے۔ جس کے لیے وہ کافی ہوجائے وہ کسی

کا محتاج نہیں ہے، اس کا پلہ ہر باوزن شے سے گراں تر ہے اور یہ سرمایہ ہر خزانے سے زیادہ قیمتی ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور یہ وہ گواہی ہے جس کے اخلاص کا امتحان ہو چکا ہے اور جس کا حاصل عقیدے کا جز بن چکا ہے، میں اس گواہی سے تا حیات وابستہ رہوں گا اور اسی کو روزِ قیامت کے ہولناک مراحل کے لیے ذخیرہ بناؤں گا۔ یہی ایمان کی مستحکم بنیاد ہے اور یہی نیکیوں کا آغاز ہے اور اسی میں رحمان کی مرضی اور شیطان کی تباہی کا راز مضمر ہے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اُس کے رسول ہیں۔ انہیں پروردگار نے مشہور دین، ماثور نشانی، روشن کتاب، ضیاء پاش نور، چمکدار روشنی اور واضح امر کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ شبہات زائل ہو جائیں اور دلائل کے ذریعے حجت تمام کی جا سکے۔ آیات کے ذریعے ہوشیار بنایا جا سکے اور مثالوں کے ذریعے ڈرایا جا سکے۔''

خطبہ ایک نگاہ میں

یہ خطبہ پانچ اہم مضامین پر مشتمل ہے (جو چار حصّوں میں قابلِ بحث و تحقیق ہے)

پہلا مقام: حمد و ثنائے پروردگار اور اُس کے فضل و کرم اور رحمت کے سائے میں پناہ لینا۔

دوسرا مقام: پروردگارِ عالم کی یکتائی کی گواہی اور توحید پر ایمان کے گہرے اثرات۔

تیسرا مقام: نبوت کی گواہی کے ساتھ ہی ساتھ فضائلِ پیغمبرؐ کے ایک اہم حصّے کا بیان، زمانۂ جاہلیت کے حالات، اسلامی معاشرے کی عظیم مشکلات اور بیان ہے ان تکلیف دہ حالات کا جن سے معاشرے کی اصلاح کے سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبرد آزما ہونا پڑا۔

چوتھا مقام: اہل بیت علیہم السلام کا مقام و مرتبہ اور عظمت اور لوگوں کے دینی مشکلات کے بارے میں اُن کے پاس پناہ لینے کی طرف اشارہ ہے۔

پانچواں مقام: بھی اہل بیت علیہم السلام کی عظمت کے بارے میں ہے، جسے ایک اور انداز سے پیش کرتے ہوئے لوگوں کو آلِ محمدؐ کے بارے میں خبردار کیا ہے کہ اس اُمّت کا کوئی فرد بھی ان کے مقام کے برابر نہیں۔ اس کے بعد اہل بیت علیہم السلام کی خصوصیات کو بیان کیا ہے نیز حق اُس کے اہل تک پہنچنے کی خوشی کا اظہار فرمایا ہے۔

وہ حالات جن میں یہ خطبہ دیا گیا

جیسا کہ خطبے کے شروع میں ہم پڑھ چکے ہیں مرحوم سیّد رضیؒ نے واضح کیا ہے کہ یہ خطبہ صفین سے واپسی کے بعد

ارشاد فرمایا ہے۔ خطبے کا سیاق وسباق بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ دراصل زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کے مزاج اور حالات کے نشیب وفراز، اس حقیقت کو بیان کر رہے ہیں کہ ''زمانۂ جاہلیت کے نظام'' سے ہر لمحہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، یہ جہالت دوبارہ زندہ ہوسکتی ہے۔ اِن کے والی ووارث اور پیروکار دوبارہ برسر اقتدار نہ آنے پائیں۔ ان لوگوں کا تعلق، بنیادی طور پر لشکرِ شام (میدانِ صفین) سے تھا اور حضرت امام علی علیہ السلام اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہیں، کیونکہ خود پیغمبرؐ نے کئی بار فرمایا ہے: میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، ان (قرآن واہلِ بیتؑ) سے متمسک رہو گے تو گمراہ نہیں ہو گے۔

واضح رہے کہ ابن ابی الحدید نے عجلت کی وجہ سے خطبے کو سمجھنے میں غلطی کی ہے، وہ کہتے ہیں خطبے کے آخری حصّے کا سیاق وسباق صفین سے واپس پلٹنے کے زمانے سے مناسبت نہیں رکھتا، کیونکہ وہ زمانہ حکمیت کے واقعے عمرو بن عاص کی مکاریوں اور امیر شام کی منہ زوریوں کا زمانہ تھا، جو امیر المومنینؑ کے لشکر میں ظاہر ہوا، ایسی صورتحال آغازِ خلافت سے مناسبت رکھتی ہے، اگر سیّد رضیؒ اس خطبے کو صفین سے واپسی کے زمانے سے نسبت دیتے ہیں تو اُس میں اُن کی کوئی غلطی نہیں، کیونکہ اُنھوں نے سابقہ مورّخین سے لیا ہے اور عین ممکن ہے کہ یہ غلطی اُن مورّخین سے ہوئی ہو۔ [1]

بعض دانشمندوں کے مطابق یہ بات ایسے شخص کے بارے میں کہی جانی چاہیے، جو علم کا پہاڑ، بحرِ وقار نیز جہاد و استقامت کا نمونۂ کامل نہ ہو۔ کوئی شخص حضرت علیؑ کی طرح کھلے دل سے اس حادثے کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ بلند روح اور وسیع فکر اجازت نہیں دیتی ہے کہ حالات سے پریشان اور مضطرب ہو، بلکہ اس کے برعکس جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ امامؑ نے لوگوں کو غفلت سے بیدار کیا ہے۔ یہ خطبہ لوگوں کو تنبیہہ کرتا ہے کہ زہریلی تبلیغ کو اور شیطانی حکمرانوں کو قبول نہ کریں اور دورِ جاہلیت کی طرف نہ پلٹیں اور اس طرح جس طرح حق کہتا ہے، اس سے دُور مت ہو جائیں اور آخر تک استقامت کا مظاہرہ کریں۔

ابن ابی الحدید معتقد ہے کہ صفین کے میدان میں امیر شام کی جیت ہوئی ہے جب کہ اس فتح اور مولا علیؑ کے اس قول: ''اَلْآنَ اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰی اَهْلِهٖ'' اب حق اپنے حقدار کے پاس پہنچ گیا'' کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا، جبکہ یہ ہماری نظر میں ایک غلط فہمی ہے، اس لیے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ امیر شام ہرگز کامیاب نہیں ہوا، وہ صرف عمرو عاص کی چالاکی سے ایک یقینی شکست سے بچ گیا۔ اور حضرت علیؑ حق کو اس کے اہل (یعنی اپنے اور اہل بیتؑ) کے اختیار میں دیکھنا چاہتے ہیں اور لوگوں کو خبردار کرتے ہیں کہ ہوشیار ہو جاؤ کہیں حق حقدار سے نہ چھینا جائے۔

---

[1] شرح ابن ابی الحدید: ج۱، صفحہ ۱۴۳

حکمیّت کی داستان اور عمرو ابن عاص کے ظالمانہ اور مکروہ فیصلے کا قصہ (بعض کے نظریے کے برعکس) میدانِ صفین میں حضرت امام علیؑ کی موجودگی میں نہیں ہوا، بلکہ چند مہینے بعد یہ واقعہ پیش آیا، قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ خود ابن ابی الحدید نے دوسرے مقام پر اس معنی کی تصریح اور وضاحت کی ہے۔ اس بنا پر ابن ابی الحدید کا اس خطبے کے آخری جملے کو جنگِ صفین کے بعد نہ ہونے کے لیے دلیل کے طور پر پیش کرنا، غیر معتبر ثبوت اور ایک باطل گواہی ہے۔

شرح وتفسیر

اسلام کے دو بنیادی ارکان

یہ خطبہ نہج البلاغہ کے دوسرے خطبوں کی طرح حمد وثنائے پروردگار سے شروع ہوتا ہے، لیکن یہاں پر حمد وستائشِ پروردگار کے لیے تین وجوہات بیان ہوئی ہیں۔ سب سے پہلی یہ کہ نعماتِ الٰہی زیادہ ہوں اور ان کے پورا ہونے کا تقاضا کرنا اور دوسرے ذاتِ خدا کی عزت اور قدرت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا، تیسرے اُس کے لطف وکرم سے گناہوں سے محفوظ رہنا۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"اَحْمَدُہٗ اسْتِتْمَامًا [1] لِنِعْمَتِہٖ وَاسْتِسْلَامًا [2] لِعِزَّتِہٖ وَاسْتِعْصَامًا [3] مِنْ مَّعْصِیَّتِہٖ"

''اُس کی حمد وثنا کرتا ہوں کہ اُس کی نعمتوں کی تکمیل ہونے کی خاطر اور اُس کی عزت وقدرت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں اور اُس کی معصیت اور نافرمانی سے محفوظ رہنے کا تقاضا کرتا ہوں۔''

توجہ رہے کہ حمد کا مفہوم ایسی چیز ہے جو شکر سے زیادہ ہو، دوسرے الفاظ میں شکر، ستائش کے ساتھ آمیختہ ہے اور یہ ایک طرف نعمتِ الٰہی کے زیادہ ہونے کا سبب ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ" [4]

''اگر میرا شکر کرو گے تو میں یقیناً تم پر (نعمت کی) زیادتی کروں گا۔''

---

[1] اشتتمام، کبھی تمام ہونے کے معنی میں آیا ہے، کبھی مطالبات کے تمام ہونے کے معنی میں، یہاں بعد والے جملوں کے اعتبار سے معنیٔ دوّم مراد ہیں۔

[2] استسلام، اطاعت گزاری وتسلیم کے معنی میں آیا ہے۔ بعض اہلِ لغات کی نظر میں کسی چیز کے بارے میں، ''ظاہر وباطن کا ایک ہونا'' اور اطاعت گزاری اس کے لوازمات میں سے ہے۔

[3] استعصام سے مراد مطالبہ کرنا اور دیکھ بھال کرنا، نامناسب امور سے دوری اختیار کرنا ہے۔

[4] سورۂ ابراہیمؑ: آیت ۷

اور دوسری طرف عبودیت اور بندگی کے انجام دینے کا پہلو بھی موجود ہے اور یہ وہی عزّتِ پروردگار کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے جبکہ تیسری طرف خدا کی طرف سے ایسا لطف و کرم اور امدادِ غیبی نیز عنایاتِ الٰہی شامل حال ہوتی ہیں، جن سے انسان گناہوں سے محفوظ رہتا ہے۔ حمد و ثنا کے بعد پروردگار سے مدد طلب کرنے کے عمل کو بیان کرتے ہیں اور اُس کی دلیل بھی بیان فرماتے ہیں:

"وَاَسْتَعِيْنُهُ فَاقَةً اِلٰى كِفَايَتِهٖ"

''اُس سے مدد مانگتا ہوں، کیونکہ اُس کی مدد اور کفایت کا محتاج ہوں۔''

جی ہاں! جب ایک باخبر بندہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اُس ذاتِ بے نیاز کا محتاج دیکھتا ہے تو اپنے ہاتھ کو اُس کے لطف و کرم کے سامنے پھیلاتا ہے اور ہر چیز کے لیے ہر حالت میں اُس سے مدد چاہتا ہے۔ خدا سے مدد مانگنے کے بارے میں مولا امام علی علیہ السلام ایک اور دلیل بیان فرماتے ہیں:

"اِنَّهٗ لَا يَضِلُّ مَنْ هَدَاهُ وَلَا يَئِلُ[1] مَنْ عَادَاهُ وَلَا يَفْتَقِرُ مَنْ كَفَاهُ"

''خدا جس کسی کی بھی ہدایت کرے گا وہ گمراہ نہیں ہوگا اور جسے خدا دشمن رکھے کبھی نجات نہیں پائے گا اور جس کسی کی سرپرستی کرے وہ کبھی محتاج نہیں ہوگا۔''

جی ہاں اُس کی قدرت اتنی ہے کہ کوئی اُس کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور اُس کا علم اتنا ہے کہ اُس سے خطا ہو نہیں سکتی۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تین جملے حمد کے لیے ہی ہوں اور استعانت کے لیے، دوسری دلیل بھی ہے، اِس کلام کے آخر میں خدا کی حمد کے لیے ایک نئی دلیل اور نکتہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَاِنَّهٗ اَرْجَحُ مَا وُزِنَ وَاَفْضَلُ مَا خُزِنَ"

اگر خدا کی ستائش کا وزن معلوم کیا جاسکے تو یہ ہر چیز سے بھاری ہوگی اور ذخیرہ کرنے کے لیے، ہر خزانے سے زیادہ قیمتی ہوگی۔''

حقیقت میں وہ فوائد اور آثار جو گزشتہ جملوں میں ذکر ہوئے ہیں، وہ اس دنیا سے مربوط ہیں۔ اور آخری دو جملوں میں جو ذکر ہوا ہے، وہ دوسری دنیا کے ساتھ مربوط ہے اور قیامت کے دن کے لیے ایک ذخیرہ ہے۔ اِس بنا پر حمد پروردگار نجاتِ دنیاوی و آخروی کا ذریعہ ہے۔ سبحان اللہ! ان چھوٹے چھوٹے جملوں میں ہر پہلو کو اُس کے تمام نکات کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

---

[1] يَئِلُ، مادّہ، وَألَ بروزن وعد نجات پانا اور پناہ لینا اور واپس آنا کے معنیٰ میں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ابن ابی الحدید اس خطبے کی تشریح کے مقام پر پہنچے تو کلمات اور لطائف امیر المومنینؑ میں ڈوب کر بے ساختہ پکار اُٹھے:

"فَسُبْحَانَ مَنْ خَصَّهُ بِالْفَضَائِلِ الَّتِیْ لَا تَنْتَهِیْ اَلْسِنَةُ الْفُقَهَاءِ اِلٰی وَصْفِهَا وَ جَعَلَهُ اَمَامَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ وَ قُدْوَةَ كُلِّ صَاحِبِ خَصِّیَّةٍ"

''پاک ہے وہ خدا جس نے علیؑ کو ایسے فضائل سے نوازا ہے کہ بڑے بڑے ادیب وسخنور مولا علیؑ کی توصیف کرنے سے عاجز وحیران رہ گئے ہیں، نیز ہر صاحبِ فضیلت کے لیے آپ کو رہنما اور پیشوا بنایا۔''

اس کے بعد آپؑ تمام فضائل، نیکیوں اور افتخارات کی جڑ یعنی توحید کی گواہی دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِیْكَ لَهُ"

''میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا اور لاشریک ہے۔''

مولا علی علیہ السلام نے توحید کے سائے میں پناہ اس لیے لی ہے کہ یہ تمام پاک و پاکیزہ افکار اور عقائد نیز اعمالِ صالح کی بنیاد ہے۔ اس کے علاوہ توحید کی پناہ میں جانے کا تذکرہ اس لیے بھی کیا ہے تا کہ علیؑ کو خدا سمجھنے والے اپنی غلط فہمی کو جان لیں اور باطل عقیدے کی اصلاح کر لیں۔ مزید فرماتے ہیں:

"شَهَادَةً مُمْتَحَنًا[1] اِخْلَاصُهَا، مُعْتَقَدًا مُصَاصُهَا"[2]

''یہ میری گواہی دینا توحید کے بارے میں، ایک سادہ گواہی نہیں، بلکہ یہ ایسی گواہی ہے جس کا خلوص پرکھا جا چکا ہے اور جس کا خمیر بغیر کسی شبہے کے میرے عقیدے کی جان بن چکا ہے۔'' (صرف میری زبان ہی نہیں بلکہ میرے وجود کا رواں رواں جسم وروح کی گہرائی کے ساتھ گواہی دیتا ہے)

یہ صرف ایک گواہی نہیں ہے جو جلد بازی میں انجام پائی ہو بلکہ یہ ایسی گواہی ہے:

"نَتَمَسَّكُ بِهَا اَبَدًا مَّا اَبْقَانَا، وَنَدَّخِرُهَا لِاَهْوَالِ[3] مَا یَلْقَانَا"

''جب تک خدا نے ہمیں باقی رکھا ہم اِس سے جڑے رہیں گے اور پیش آنے والے تمام ہولناک مواقع میں یہ

---

[1] ممتحن، کا مادّہ محن بروزنِ رہن سے ہے، جس کے معنی آزمائش اور امتحان ہیں، لیکن بعض اہلِ لغت نے اس کے معنی ''کنواں کھودتے وقت، مٹی نکالنا'' کیے ہیں۔

[2] مصاص، کا مادّہ مص ہے (بروزنِ نص) اصل میں اس کے معنی چکھنا اور چوسنا ہے۔ بات یہ ہے کہ چوسنے کا عمل ایسا ہے کہ جو کسی چیز کے نچوڑ اور خالص اجزاء کو انسان کے بدن میں منتقل کرتا ہے، لہٰذا ''مصاص'' خالص کے معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

[3] ''اھاویل''، جمع ''اھوال'' ہے اور اس کا مفرد ''ھول'' ہے جس کے معنی ڈر اور وحشت ہیں۔

بہترین ذخیرہ ہے۔''

امامِ عالی مقامؑ اس گفتگو میں ایمان کی گہرائی کو بیان کرتے ہوئے زندگی کے ہر میدان میں، قدم قدم پر روحِ توحیدی سے سرشار نیز سراپا پیکرِ توحید نظر آتے ہیں۔ جس نے بھی اس بزرگ ہستی کی زندگی کا مطالعہ کیا، اس حقیقت کو آپؑ کی تمام زندگی میں واضح طور پر دیکھے گا کہ لمحہ بھر کے لیے بھی شرک سے آلودہ نہیں ہوئے، کبھی کسی بت کے سامنے نہیں جھکے، ہمیشہ مزاجِ توحید کے مطابق عمل کیا اور ہر قسم کے شرکِ جلی اور خفی سے بیزار رہے۔ پھر اس اصول کا پابند رہنے کے لیے چار دلیلوں کا ذکر فرمایا:

"فَاِنَّهَا عَزِيْمَةُ الْاِيْمَانِ، وَفَاتِحَةُ الْاِحْسَانِ، وَمَرْضَاةُ الرَّحْمٰنِ، وَمَدْحَرَةُ[1] الشَّيْطَانِ"

''یہ گواہی ایمان کا بنیادی اور اصلی ستون اور اس کی روح ہے۔ تمام نیکیوں کا سرچشمہ، اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ اور شیطان سے دوری کا سبب ہے۔''

چنانچہ عنقریب نکات کے ذیل میں آئے گا کہ عقیدۂ توحید کے بغیر اُصولِ دین پر ایمان کے مراتب کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اور تمام نیکیاں اور اعمالِ صالح حقیقت توحید سے ہی وابستہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کی خوشنودی اور شیطان سے دوری کا سبب ہے، کیونکہ شیطان کا اہم ہتھیار شرک ہے خواہ وہ شرکِ جلی کی صورت میں ہو یا شرکِ خفی کی صورت میں، نیز اُس کا اظہار کیا جائے یا اُسے مخفی رکھا جائے۔

نہج البلاغہ کے بعض مفسرین نے "فَاتِحَةُ الْاِحْسَانِ" کے معنی کو ''اللہ کی عطا کردہ نیک پاداش سے تعبیر کیا ہے جس کی ابتدا توحید ہے، لیکن مذکورہ بالا تفسیر ہماری نظر میں بہتر ہے۔ خدا کی وحدانیت کی گواہی دینے کے بعد دوسرا اہم نکتہ نبوت کی گواہی دینا ہے اور فرمایا:

"وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ"

''اور یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کے عبد اور رسول ہیں۔''

جی ہاں! آپ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے سے پہلے اللہ کے خاص بندے تھے اور جب تک کوئی بندہ خاص نہ ہو، رسالت کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ دراصل ان لوگوں کے اعتراض کا جواب ہے جو خدا کے رسولوں کو خدا کی حد تک پہنچا دیتے ہیں اور جو چیز (یعنی بندگی) پیغمبروں کے لیے باعث افتخار ہے (کفّار) اُسے اُن سے چھین لینا چاہتے تھے، پھر آپؑ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور فریضے کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

[1] ''مدحرۃ'' کا مادّہ ''دحر''، باہر نکال دینا، بے دخل کرنا اور دور کرنے کے معنیٰ میں آتا ہے۔

"اَرْسَلَهُ بِالدِّيْنِ الْمَشْهُوْرِ وَالْعَلَمِ الْمَأْثُوْرِ [۱] وَالْكِتَابِ الْمَسْطُوْرِ، وَالنُّوْرِ السَّاطِعِ [۲] وَالضِّيَاءِ اللَّامِعِ، وَالْاَمْرِ الصَّادِعِ" [۳]

''اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ظاہر اور آشکار دین وقانون، روشن نشانی، تحریر شدہ کتاب، درخشاں نور، جگمگاتی روشنی، حکم قطعی اور فرمانِ الٰہی کے ساتھ بھیجا کہ جس میں کسی قسم کی پردہ داری نہیں ہے۔''

مذکورہ چھے جملے جو نہایت حیرت انگیز اور گہرے معنی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں، یہ کن مسائل کی جانب اشارہ کر رہے ہیں؟ ان کے بارے میں مختلف قسم کی تفسیریں وجود رکھتی ہیں۔ سب سے پہلے یہ ہے کہ ''دین مشہور'' آئین اسلام کی طرف اشارہ ہے اور ''علمِ ماثور'' سے معجزات کی طرف اشارہ ہے۔ ''کتابِ مسطور'' سے قرآن مراد "وَالنُّوْرِ سَاطِعِ" سے علوم الٰہی مراد ہیں، جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچے اور "وَالضِّيَاءِ اللَّامِعِ" سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سمجھ میں آتی ہے اور "وَالْاَمْرِ الصَّادِعِ" قرآن کی آیت "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" کی مناسبت سے مراد تقیہ کو ترک کرنا اور مخالفین اور مشرکین کے سامنے کھلم کھلا توحید کا اظہار کرنے کی طرف اشارہ ہے:

"وَالنُّوْرِ السَّاطِعِ" "وَالضِّيَاءِ اللَّامِعِ"

یہ قرآن کی مزید صفات کی وضاحت ہے، کیونکہ یہ آسمانی کتاب، انسانی افکار اور معاشروں کے لیے نورانیت کا باعث ہے۔ اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھیجنے، قرآن کے آپؐ پر نازل ہونے، نیز معجزات، قوانین اور احکامِ الٰہی کے اصل مقصد کو بیان فرماتے ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت عطا کرنے اور آپؐ کی بعثت اور اس کے اہتمام چند اہم مقاصد تھے:

"اِزَاحَةً [۴] لِلشُّبَهَاتِ، وَاحْتِجَاجًا بِالْبَيِّنَاتِ، وَتَحْذِيْرًا بِالْآيَاتِ، وَتَخْوِيْفًا بِالْمَثُلَاتِ [۵]"

''دنیا والوں کے دل و دماغ سے ہر قسم کے شکوک وشبہات کو دور کیا جائے؛ روشن و واضح دلیل اور منطق کے ساتھ

---

[۱] ماثور، کا مادّہ اثر، ہے، علامت اور نشانی کے معنی میں آتا ہے۔ ایسی نشانی جو کسی چیز میں سے باقی رہ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ انسانوں سے باقی رہنے والے علوم (آثار) کو (جو ہم تک پہنچے ہیں) ''علومِ ماثور'' کا نام دیا جاتا ہے۔

[۲] ساطع کا مادّہ سطوع ہے، یہ منتشر کرنے، اونچا ہونے نیز لہرانے اور اونچائی پر نمایاں ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسی وجہ سے ''نورِ ساطع'' سے ''ہر طرف پھیلی ہوئی روشنی'' مراد لی جاتی ہے۔

[۳] صادع کا مادّہ صدع ہے۔ مضبوط چیزوں میں شگاف پیدا کرنے کے معنیٰ میں آتا ہے۔ نیز ہر قسم کی ''قاطعیت اور مصمم ہونے'' پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

[۴] ازاحۃ، کا مادّہ زیح، ہے ''بروزن زید''، یہ دور ہونے کے معنی میں آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ''ازاحۃ'' دور کرنے اور ظاہر کرنے'' کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

[۵] مثلات، جمع ہے مثلہ کی (بروزنِ عضلہ) یہ مصیبت، بلا اور پریشانی کے معنی میں آتا ہے کہ جو انسان کو لاحق ہوتی ہے اور دوسروں کے لیے سبق آموزی نیز عبرت کا باعث بنتی ہے، (مفرداتِ راغب، تحقیق، صحاح اور مجمع البحرین)

استدلال کریں؛ آیاتِ الٰہی کی مدد سے لوگوں کو خدا کی مخالفت سے روکیں اور اُس کی مخالفت کے انجام سے ڈرائیں۔''

ان چار جملوں کی تفسیر میں بھی یہ کہہ سکتے ہیں "اِزَاحَةً لِلشُّبَهَاتِ" سے ان حقائق کی طرف اشارہ ہے، جو الٰہی دلائل کی روشنی میں واضح ہیں۔ اور ہر قسم کے شک و شبہے کو دور کر دیتے ہیں "وَاحْتِجَاجًا بِالْبَيِّنَاتِ" سے مراد 'معجزاتِ حسّی' ہیں۔ ان کی ضرورت، ایسے لوگوں کے لیے ہوتی ہے جو ''عقلی دلائل'' سے مطمئن نہیں ہوتے، لیکن جب کھلی آنکھوں سے معجزہ دیکھتے ہیں تو یقین اور ایمان تک پہنچ جاتے ہیں۔ "وَتَحْذِيرًا بِالْآيَاتِ" سے مراد آخرت کے بُرے انجام سے ڈرانے کی طرف اشارہ ہے۔ "وَتَخْوِيفًا بِالْمَثُلَاتِ" سے مراد دنیاوی سزاؤں سے ڈرانے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

"وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلَاتُ"۔[1]

''اور (اے رسولؐ) یہ لوگ تم سے بھلائی کے قبل ہی برائی (عذاب) کی جلدی مچا رہے ہیں (حالانکہ ان کے پہلے (بہت سے لوگوں کی) سزائیں ہو چکی ہیں۔''

اہم نکات

۱۔ توحید، تمام نیکیوں کی جڑ

''اللہ کی وحدانیت کی گواہی'' معمولاً دوسرے اصولوں کے مقابلے میں ایک اصول اعتقادی سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ ایک بہت سادہ اور سطحی سی سوچ ہے، اس نہایت اہم اسلامی اصول کے بارے میں اسلامی مآخذ اور عقلی تجزیات کی روشنی میں توحید روح کی حیثیت رکھتی ہے، جو تمام اصول اور فروع میں جاری و ساری ہے۔ دوسرے الفاظ میں ''اسلام کے تمام اصول اور فروع'' دراصل توحید ہی کا مظہر ہیں، نہ صرف اعتقادات اور عبادات کے موضوعات بلکہ اجتماعی، سیاسی اور اخلاقی مسائل پر بھی روحِ توحید حاکم ہے۔

خدا کی وحدانیت، خواہ ذات و صفات میں ہو خواہ افعال و بندگی میں، ایک روشن اور مسلّم امر ہے۔ جہاں تک انبیائے کرامؑ کی نبوت کا معاملہ ہے تو "لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّن رُّسُلِهٖ"[2] کے مطابق ہم بھی انبیاءؑ اور رسولوں کے درمیان

---

[1] سورۂ رعد: آیت ۶

[2] سورۂ بقرہ: آیت ۲۸۵

فرق کے قائل نہیں اور معتقد ہیں کہ سب کے سب ایک نظریے کے داعی اور ایک ہی پیغام کو پہنچانے والے ہیں لیکن زمانے کے گزرنے کے ساتھ اور انسانی معاشروں کے ترقی یافتہ ہونے کی بنا پر بعض احکام اور پروگرام نئی شکلوں میں پیش کیے گئے ہیں۔ قیامت کے موضوع پر اس آیت:

"وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا"[1]

''اور یہ سب کے سب اس کے سامنے قیامت کے دن اکیلے (اکیلے) حاضر ہوں گے۔''

کے مطابق ہر شخص انفرادی حیثیت میں اللہ کے سامنے پیش ہوگا اور ایک معیار کے مطابق سب کے ساتھ انصاف ہوگا۔ ہر ایک کو اپنے اعمال کے حساب سے جزا ملے گی، سب ثابت اور معیّن ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ آسمانی ادیان کے بارے میں الٰہی قوانین کی شاخوں اور پتّوں میں تو ضرور فرق ہے، لیکن ان سب کی بنیاد اور اصل ایک ہے، اسی دلیل کی بنا پر ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام ایک متحدہ عالمی معاشرے کی جانب، تمام انسانوں کو دعوت دیتے رہے ہیں۔

اور آخر کار پوری کائنات کو ایک عادل حکومت کے زیرِ سایہ جمع ہونا ہے۔ اخلاقی مسائل کے بارے میں، کون ہے جو یہ نہ جانتا ہو کہ اخلاقی فضائل کا تعلق توحید سے ہے اور اَخلاقی برائیوں (رذائل) کا تعلق شرک سے ہے۔ ریاکار افراد شرک میں مبتلا ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح، جس طرح حسد کرنے والے، بخل سے کام لینے والے، لالچ رکھنے والے اور تکبّر کرنے والے شرک میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جو کوئی بھی خدا کی توحیدافعال کو دل کی گہرائی سے قبول کرتا ہے اور عزت وذلّت، روزی، زندگی، کامیابی کو خدا سے نسبت دیتا ہے تو ممکن نہیں کہ وہ ریا، حرص، بخل اور حسد کو اپنے دل میں کوئی جگہ دے سکے۔

ایک مختصر سی بات یہ ہے کہ توحید، تسبیح کے ایک بڑے اور نمایاں دانے کی طرح نہیں ہے کہ جو بقیہ دانوں سے بڑی جسامت رکھتا ہے بلکہ توحید کی مثال تسبیح کے دھاگے جیسی ہے کہ جس میں سارے دانے پرو دیے گئے ہیں۔ اس مقام پر مولا علیؑ کے کلام کی گہرائی مذکورہ بالا جملوں سے بخوبی روشن اور واضح ہو جاتی ہے۔ توحید کی اس قدر اہمیت، اس لیے ہے کہ توحید، ایمان کا بنیادی ستون، توحید ایمان کی اصل بنیاد، تمام نیکیوں کی شروعات، خدا کی خوشنودی کا سبب اور شیطانِ مردود سے دوری کا باعث ہے۔ اگر توحید کی نورانیت انسان کے جسم و جان کو اپنے حصار میں پوری طرح لے لے، اس طرح کہ پورا انسانی معاشرہ اُس کے نور میں ڈوب جائے تو اب جو توحید کے سائے میں ہر چیز کی شکل وصورت اُبھر کر سامنے آئے گی، وہ کچھ اور ہی رنگ کی ہوگی۔ اسی لیے مولائے متقیان علی علیہ السلام جو خود روحِ توحید ہیں، نہج البلاغہ کے اکثر و بیشتر خطبوں میں توحید اور خدا کی وحدانیت کی گواہی کو بار بار یاد دلاتے ہیں اور اس طرح اپنے مکتب کے پیروکاروں کو توحید کی تعلیم دیتے ہیں، تاکہ عالم اسلام

---

[1] سورۂ مریم: آیت ۹۵

کے ہر عام وخاص کے وجود میں ایک ایسا شعلہ بھڑکا دیں، جو ان کے دلوں کو (حق کے لیے) بے قرار رکھے، اور توحید کے آبِ حیات سے اُن کی جانوں کی اس طرح آبیاری ہو کہ اُن کا پورا وجود نیکی اور پاکیزگی کی فصلیں اُگانے کے لیے زرخیز ہو جائے اور اس طرح توحید کا اثر ان پر ہو کہ "صِبْغَةَ اللّٰهِ" یعنی اللہ کا رنگ ان کا مزاج بن سکے، نیز یہ صلاحیت ان کے اندر پوری طرح بیدار ہو جائے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی گواہی، آپؐ کے فرائض کے بارے میں غور وفکر کرنا نیز قرآن میں تدبّر یقینی طور پر ایسا بہترین وسیلہ ہے، جو حقیقتِ توحید کو انسانوں کے وجود کی گہرائی تک پہنچنے کو ممکن بناتا ہے۔

۲۔ امیر المومنینؑ کی زندگی میں توحید خالص کی تجلی

حضرت علی علیہ السلام اس سے پہلے کہ دوسروں کو اس بزرگ حقیقت، توحید کی طرف دعوت دیتے، بذاتِ خود سراپا توحید کا پیکر تھے۔ پوری زندگی میں ایک لحظہ کے لیے بھی بتوں کو سجدہ نہیں کیا اور اپنے پاکیزہ دامن کو شرک سے بچائے رکھا، جو بھی قدم اٹھایا خدا کے لیے اور جو فعالیت بھی کی وہ صرف رضائے الٰہی کی خاطر۔ اپنی عمر کے آغاز سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری سانس تک ہر جگہ آپؐ کی خدمت میں رہے اور دل وجان سے کوشش کی۔ معروف جنگ کی داستان کہ جس میں عمرو ابن عبدود زمین پر گر پڑا اور حضرت علی علیہ السلام چاہتے تھے کہ اس کا کام تمام کر دیں، مشہور ہے کہ اسلام کے سپاہیوں نے دیکھا کہ اس حساس لمحے میں حضرت علی علیہ السلام نے اپنا ہاتھ روک لیا (اور عمرو بن عبدود کے سینے سے اُتر کر چند قدم چلے) پھر دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کا کام تمام کر دیا۔ جب اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا:

"قَدْ كَانَ شَتَمَ اُمِّيْ وَتَفَلَ فِيْ وَجْهِيْ فَخَشِيْتُ اَنْ اَضْرِبَهُ لِحَظِّ نَفْسِيْ فَتَرَكْتُهُ حَتّٰى سَكَنَ مَا بِيْ ثُمَّ قَتَلْتُهُ فِي اللّٰهِ"[1]

''اس نے میری ماں کو بُرا کہا اور لعاب دہن کو میری طرف پھینکا، مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں میرے آخری وار میں میرا غصّہ شامل نہ ہو جائے، لہٰذا میں اُسے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا اور جب اطمینان ہو گیا کہ میرا نفس اس کام میں شامل نہیں اور صرف خدا کی مرضی کو پورا کر رہا ہوں تو پھر آخری وار کیا اور اُسے قتل کر دیا۔''

جب آپؑ کو آپ کے کچھ ساتھیوں نے آپ کو یہ شرک آلود تجویز دی کہ بڑے بڑے لوگوں کو اپنی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے استعمال کیجیے اور اپنا وفادار بنانے کے لیے، مسلمانوں کے بیت المال میں سے ایک خصوصی وظیفہ ایسے افراد کے لیے مخصوص کر دیں، تو آپؑ نے اس غلط سوچ کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

---

[1] مناقب ابن شہر آشوب، جلد ۲، ص ۱۱۵۔ مستدرک الوسائل، جلد ۱۸، ص ۲۸۔ بحار الانوار، جلد ۴۱، ص ۵۱

اَتَاْمُرُوْنِّیْ اَنْ اَطْلُبَ النَّصْرَ بِالْجَوْرِ فِیْمَنْ وُلِّیْتُ عَلَیْهِ وَاللّٰهِ لَا اَطُوْرُبِهٖ مَاسَمَرَ سَمِیْرٌ وَمَا اَمَّ نَجْمٌ فِی السَّمَاءِ نَجْمًا [1]

''کیا تم مجھے یہ مشورہ دے رہے ہو کہ اپنی کامیابی کے لیے ظلم سے مدد لوں، کسی کا حق غصب کر کے حکومت کروں ،خدا کی قسم جب تک زندہ ہوں اور جب تک یہ دن رات باقی ہیں اور آسمان کے ستارے بھی مسلسل طلوع اور غروب ہوتے رہیں گے، ان چیزوں میں ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔''

جب آپؑ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے تو ایسے خدا کی صفاتِ جلال و جمال میں غرق ہو جاتے کہ اُس ذات کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھتے، کسی دوسرے کا خیال نہیں آتا۔ جیسا کہ غزوۂ اُحد کا مشہور واقعہ ہے، جب حضرت علیؑ کے پائے مبارک میں تیر لگا، جسے عام حالات میں نکالنا ممکن نہ تھا، لہٰذا رسول اکرمؐ نے حکم فرمایا کہ نماز کی حالت میں یہ کام کیا جائے (اور ایسا ہی کیا گیا) نماز کے اختتام پر امیر المومنینؑ نے فرمایا: مجھے بالکل بھی محسوس نہ ہوا [2] ایسے توحید پرور واقعات، مولائے کائناتؑ کی زندگی میں ان گنت ہیں۔

دوسرا حصّہ

وَ النَّاسُ فِیْ فِتَنٍ انْجَذَمَ فِیْهَا حَبْلُ الدِّیْنِ وَ تَزَعْزَعَتْ سَوَارِی الْیَقِیْنِ وَ اخْتَلَفَ النَّجْرُ وَ تَشَتَّتَ الْأَمْرُ وَ ضَاقَ الْمَخْرَجُ وَ عَمِیَ الْمَصْدَرُ فَالْهُدٰی خَامِلٌ وَ الْعَمٰی شَامِلٌ عُصِیَ الرَّحْمٰنُ وَ نُصِرَ الشَّیْطَانُ وَ خُذِلَ الْإِیْمَانُ فَانْهَارَتْ دَعَائِمُهُ وَ تَنَکَّرَتْ مَعَالِمُهُ وَ دَرَسَتْ سُبُلُهُ وَ عَفَتْ شُرُکُهُ أَطَاعُوا الشَّیْطَانَ فَسَلَکُوْا مَسَالِکَهُ وَ وَرَدُوْا مَنَاهِلَهُ بِهِمْ سَارَتْ أَعْلَامُهُ وَ قَامَ لِوَاؤُهُ فِیْ فِتَنٍ دَاسَتْهُمْ بِأَخْفَافِهَا وَ وَطِئَتْهُمْ بِأَظْلَافِهَا وَ قَامَتْ عَلٰی سَنَابِکِهَا فَهُمْ فِیْهَا تَائِهُوْنَ حَائِرُوْنَ جَاهِلُوْنَ مَفْتُوْنُوْنَ فِیْ خَیْرِ دَارٍ وَ شَرِّ جِیْرَانٍ نَوْمُهُمْ سُهُوْدٌ وَ کُحْلُهُمْ دُمُوْعٌ بِأَرْضٍ عَالِمُهَا مُلْجَمٌ وَ جَاهِلُهَا مُکْرَمٌ.

''یہ بعثت اُس وقت ہوئی ہے جب لوگ ایسے فتنوں میں مبتلا تھے جن سے دین کی رسی ٹوٹ چکی تھی، یقین کے ستون ہل گئے تھے، اصول میں شدید اختلاف تھا اور امور میں سخت انتشار، مشکلات سے نکلنے کے راستے تنگ و تاریک

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۶

[2] مناقب مرتضویہؑ، تالیف مولانا محمد صالح کشفی حنفی، ص ۳۶۴، طبع بمبئی، مطابق نقل احقاق الحق، جلد ۸، ص ۶۰۲۔

ہو گئے تھے۔ ہدایت گمنام تھی اور گمراہی سرِعام اور رحمٰن کی معصیت ہو رہی تھی اور شیطان کی نصرت، ایمان یکسر نظر انداز ہو گیا تھا، اس کے ستون گر گئے تھے اور آثار ناقابلِ شناخت ہو گئے تھے، راستے مٹ گئے تھے اور شاہراہیں بے نشان ہو گئی تھیں، لوگ شیطان کی اطاعت میں اس کے راستے پر چل رہے تھے، یہ لوگ ایسے فتنوں میں مبتلا تھے جنہوں نے انہیں پیروں تلے روند دیا تھا اور سموں سے کچل دیا تھا اور خود اپنے پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے تھے، یہ لوگ فتنوں میں حیران و سرگرداں اور جاہل و فریب خوردہ تھے۔ پروردگار نے انہیں اس گھر (مکہ) میں بھیجا جو بہترین مکان تھا لیکن بدترین ہمسائے، جن کی نیند بیداری تھی اور جن کا سرمہ آنسو، وہ سرزمین جہاں عالم کو لگام لگی ہوئی تھی اور جاہل محترم تھا۔''

شرح و تفسیر

زمانۂ جاہلیت کا ایک خاکہ

امام علی علیہ السلام نے اس مختصر اور جامع بیان میں بیس سے کچھ زیادہ جملے ارشاد فرمائے ہیں، جن میں زمانۂ جاہلیت کا کچھ اس طرح نقشہ کھینچا ہے کہ ہر پڑھنے والے نے گویا ان واقعات کو الفاظ کے ذریعے نہیں، بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ بلا مبالغہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حضرت امام علی علیہ السلام نے ان مختصر اور جامع جملوں میں ایک پوری کتاب کو سمو دیا ہے اور یہ آپؑ کے بیان کی قدرت، فصاحت و بلاغت، کلام کی گہرائی و جاذبیت نیز غیر معمولی حُسن و کشش کی علامت ہے [1]، کیونکہ جب تک کہ رسول اللہؐ کے اعلانِ اسلام سے پہلے کے حالات کو نہ سمجھا جائے اور لوگوں کی طرزِ معاشرت کو نہ پرکھا جائے، اُس وقت تک پیغمبر اکرمؐ کی نبوت کی عظمت اور انسانی معاشرے کی اصلاح اور ہدایت کے سلسلے میں جو خدمت آپؐ نے فرمائی ہے، اس کے علاوہ آپؐ کے پاکیزہ دین کی حقیقت اور اس کے اثرات کا اندازہ لگانا اور سمجھنا ممکن نہ ہوگا، یوں سمجھ لیجیے کہ اگر انبیاؑ اور ان کی تاریخ کو پہچاننا ہے، نیز پوری تاریخ میں گزرنے والے نامور عظیم انسانوں کی خدمات کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانا ہے تو اُس زمانے اور اُس وقت کے حالات کا آج اپنے زمانے اور حالات سے موازنہ کرنا ضروری ہے۔ اس موازنے کے عمل کو ایک اصول کی حیثیت حاصل ہے۔

---

[1] اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس میں ''وَ'' جو جملہ ''والناس فی فتن'' میں استعمال ہوا ہے ''وَ'' حالیہ ہے یعنی مولاؑ فرما رہے ہیں کہ خداوند عالم نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان حالات میں مبعوث کیا لیکن نہج البلاغہ کے بعض شارحین کے مطابق یہ واؤ ابتدائیہ ہے اور اس سے مولاؑ کے اپنے زمانے کے لوگ مراد ہیں لیکن یہ احتمال بہت بعید معلوم ہوتا ہے اور بہتر تفسیر پہلی ہی معلوم ہوتی ہے اگرچہ یہ ممکن ہے کہ مولاؑ لوگوں کو خبردار کر رہے ہوں کہ کہیں وہ ہوا پرستی اور خودستائی میں مبتلا ہو کر دورِ جاہلیت میں نہ پلٹ جائیں۔

پہلے چند جملوں میں ارشاد فرماتے ہیں:

"وَالنَّاسُ فِیْ فِتَنٍ انْجَذَمَ [۱] فِیْهَا حَبْلُ الدِّیْنِ، وَ تَزَعْزَعَتْ [۲] سَوَارِی [۳] الْیَقِیْنِ وَاخْتَلَفَ النَّجْرُ [۴] وَتَشَتَّتَ الْاَمْرُ وَضَاقَ الْمَخْرَجُ وَ عَمِیَ الْمَصْدَرُ"

''خدا نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُس وقت بھیجا کہ لوگ فتنوں میں مبتلا تھے؛ ایسے فتنے کہ جن سے دین سے تعلق ختم ہو چکا تھا، یقین متزلزل اور ایمان کے ستون لرز رہے تھے، یہاں تک کہ فطرتِ انسانی کے بنیادی اصول اور احترامات کے معیار بدل چکے تھے۔ لوگوں کے حالات بگڑ چکے تھے، سارے راستے مسدود ہو چکے تھے اور کسی کو کوئی سہارا نظر نہیں آ رہا تھا، نیز پناہ گاہیں آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔''

ایک طرف شیاطین کے فتنوں، اور خواہشاتِ نفسانی کے غلاموں کے وسوسوں نے ایمان، عقیدے اور دینی تعلیمات کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا تھا تو دوسری طرف بے سروسامانی نے سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور اختلافات کے شعلے ہر طرف لپک رہے تھے، اور پھر سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ ایسے حالات میں نہ کوئی پناہ گاہ (رہنمائی موجود) تھی اور نہ ہی راہِ فرار۔ اور لوگ مجبور تھے کہ ہر طرح کے انحرافات کا شکار ہوں، نیز گناہ آلود فضا میں قید، لاحاصل ہاتھ پیر مارتے رہیں۔

"حَبْلُ الدِّیْنِ" دین کی رسی کہ جو مفرد کی شکل میں استعمال ہوئی ہے، یہ دین حق کی وحدت کی طرف اشارہ ہے کہ تمام تعلیماتِ انبیاؑ کی بنیاد ایک ہے۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بعض مسائل اور احکامات میں کچھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ قرآن مجید ایک معنی خیز جملے میں سچے مومنین کی زبان سے، اس موضوع کے بارے میں فرماتا ہے:

"لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ" [۵]

''ہم اُس کے رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔''

---

[۱] انجذم کا مادّہ انجذام ہے معنی کٹنے اور الگ ہونے کے ہیں۔ جذام کی بیماری کو اسی لیے جذام کہا جاتا ہے کہ کیوں کہ اس کی وجہ سے اعضاء بدن کٹ جاتے ہیں۔

[۲] تزعزعت کا مادّہ زعزع ہے، معنی حرکت کرانا اور اضطراب پیدا کرنا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ''زعزع الریح الشجرۃ'' یعنی ہوا نے درخت کو لرزہ براندام کیا۔

[۳] سواری کی جمع ساریہ معنی ستون کے ہیں۔

[۴] نجر بروزنِ فجر معنی جڑ ریشہ اور بنیاد کے ہیں اور کبھی کبھار کسی چیز کو کاٹ کر اس کی اصلاح کے معنی میں آتا ہے۔ اور نجار کو اسی لیے نجار کہا جاتا ہے کیوں کہ وہ لکڑیوں کو کاٹ کر انہیں خاص شکل و ہیئت میں تبدیل کرتا ہے۔

[۵] سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۵

"اِخْتَلَفَ النَّجْرُ" کی عبارت سے عصر جاہلیت کے اختلافات کی طرف اشارہ ہے، جو ظاہری اختلاف نہیں تھا کہ جس کا کوئی سر و پا معلوم نہیں بلکہ اصولی اور بنیادی اختلافات تھے، بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس عبارت سے مراد یہ ہے کہ بگاڑ یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ انسانی فطرت کے بنیادی اور فطری اُصول جیسے توحید اور نیکیوں اور پاکیزگیوں سے عشق، یہ تمام متزلزل ہو چکے تھے یا یوں سمجھ لیجیے کہ ہر گروہ اپنی جگہ ایک نیا دین لیے بیٹھا تھا۔ ہر ایک کا قبلہ الگ الگ تھا۔ دراصل یہ معاشرے میں تمام اختلافات کی بنیادی وجہ تھی۔

"وَتَشَتَّتَ الْاَمْرُ" ممکن ہے یہ جملہ اس زمانے کے مذاہب کے درمیان غیر معمولی اختلاف کی طرف اشارہ ہو (جبکہ امر سے مراد امر دین لیا جائے) اور یہ بھی امکان ہے کہ اس سے مراد تمام اجتماعی امور کی پراکندگی لی جائے، چاہے دین سے مربوط ہوں یا دنیا سے، معاشرتی مسائل ہوں یا گھریلو مسائل۔

دوسرا معنی دورِ جاہلیت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ انسان شک اور تردّد کے درمیان بے ایمانی، قسم قسم کے اختلافات اور فتنہ و فساد میں غرق ہو اور اس سے بھی بڑی مصیبت یہ ہے کہ معاشرے کا ہر فرد، سراپا مایوسی کی تصویر بنا ہوا ہو۔ یہ اُس زمانے کا حقیقی نقشہ ہے۔

اس کے بعد پانچ جملوں میں اس بے سروسامانی کے مزید نتائج کو یوں بیان فرماتے ہیں:

"فَالْهُدٰى خَامِلٌ [1] وَالْعَمٰى شَامِلٌ، عُصِيَ الرَّحْمٰنُ وَنُصِرَ الشَّيْطَانُ وَخُذِلَ الْاِيْمَانُ"

''ایسی فضا قائم ہو چکی تھی کہ جس میں ہدایت کو بُھلا دیا گیا تھا۔ گمراہی اور تاریکی نے ہر جگہ ڈیرہ ڈال رکھا تھا (یہی وہ وجہ تھی کہ) خدا (رحمان) کی نافرمانی کی جارہی تھی، شیطان کا ساتھ دیا جارہا تھا، اور ایمان کو تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔''

معلوم رہے کہ راہِ خدا کو طے کرنے کے لیے ایک طرف نورِ ہدایت لازم ہے تو دوسری طرف دیکھنے والی آنکھیں۔ جس ماحول میں نہ روشن چراغ ہوں اور نہ بیدار آنکھیں۔ ایسے حالات میں خواہ مخواہ لوگ شیطانی لشکر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور پورا معاشرہ گناہ میں ڈوب جاتا ہے۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ "عُصِيَ الرَّحْمٰنُ" کے جملے میں خدا کے تمام ناموں میں سے رحمٰن کے نام کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس بات سے اشارہ ہوتا ہے کہ رحمت خداوندی کا سایہ تمام دوست و دشمن پر محیط ہوتا ہے؛ اُس کی اطاعت فطری اور روشن امور میں سے ہے، مگر دورِ جاہلیت کے اندھے دل والے اس حقیقت کو دیکھنے سے محروم تھے۔ پھر چار دوسرے جملوں میں اس طرح اس کا نتیجہ بیان فرماتے ہیں:

---

[1] خامل، معنی بھولی ہوئی چیز اور بے قیمت چیز۔

فَانْهَارَتْ[۱] دَعَائِمُهُ وَتَنَكَّرَتْ مَعَالِمُهُ وَدَرَسَتْ[۲] سُبُلُهُ وَعَفَتْ شُرُكُهُ[۳]

''ان بے سروسامانی کے حالات میں ایمان کے ارکان متزلزل اور ان کی نشانیاں معدوم ہوچکی تھیں۔ ان کے راستے ویران اوران کی شاہراہیں نظروں سے اوجھل ہوگئی تھیں۔''

دعائم کی عبارت سے مراد ممکن ہے مردانِ حق اورحق کے راستے پر چلنے والے ہوں یا انبیاؑ کی اصولی تعلیمات کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

''فَانْهَارَتْ'' کی عبارت سے ان تعلیمات کونظر انداز، درگزر، فراموش کرنے یاانہیں بھلا دینے کی طرف اشارہ ہے۔

''معالم'' سے سابقہ آسمانی کتابوں یا انبیاءؑ کے اصولِ تعلیمات کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

''سُبُلُ'' اور ''شُرُكُ'' سے مراد شناخت کے طریقے اور راستے ہیں، خواہ وہ عقلی وفطری راستے ہوں یا وحی کے طریقے اورآسمانی تعلیمات ہوں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ جیسے پہلے اشارہ ہوچکا ہے۔''شرک'' سے مراد''شاہراہ'' ہے۔ عام طور سے چھوٹے راستے اورگلی کوچے کوتو لوگ بُھلا سکتے ہیں، لیکن''شاہراہِ عام'' کا نشان آسانی سے نہیں مٹتا لیکن اُس وقت کے معاشرے کا حال یہ ہوگیا تھا کہ ہدایت کی شاہراہوں کے نشان بھی مٹ گئے تھے۔ان حالات کے نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے امام علی ؑ فرماتے ہیں:

''اَطَاعُوا الشَّيْطَانَ فَسَلَكُوا مَسَالِكَهُ''

''وہ لوگ شیطان کے پجاری بن چکے تھے اور جواس کی خواہش ہوتی تھی وہ اس راستے پر چلتے تھے۔''

ان حالات اور مشکلات میں لوگ شیطان کے دام میں پھنس چکے تھے اوراس کے من پسند راستوں پر چلتے تھے۔''

''وَوَرَدُوْا مَنَاهِلَهُ[۴]''

''اوراس کے گھاٹ پراتُر پڑے اورسیراب ہوئے۔''

وہی نتیجہ ہے جوامام علی علیہ السلام نے بعد کے جملوں میں فرمایا ہے:

---

[۱] انہارت، کا مادہ انھیار، ہے معنی کسی چیز کوگرانے اور مسمار ہونے کے ہیں۔

[۲] درست کا مادّہ دروس ہے، معنی پرانا ہونا، آثار کا مٹ جانا۔

[۳] شرکہ، بروزن حسنہ، کی جمع ہے۔بعض لوگوں نے اسے اشراک بمعنی شاہراہ کی جمع ہے۔

[۴] مناھل: منھل کی جمع۔دریا یا ندی کا گھاٹ جہاں سے پانی حاصل کیا جاسکے۔

"بِهِمْ سَارَتْ[1] اَعْلَامُهُ، وَقَامَ لِوَاؤُهُ"

''ان کے ذریعے سے (وہ لوگ جو شیطان کے وسوسوں میں گرفتار تھے) شیطان کی علامات ظاہر ہونے لگی تھیں، اور اُس کا پرچم لہرانے لگا۔''

امامِ سخن اور قوم کے امامِ برحق، حالات اور مشکلات کو زندہ تشبیہات اور محکم کنایات کے ذریعے، سننے اور پڑھنے والوں کے ذہنوں میں مجسم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فِيْ فِتَنٍ دَاسَتْهُمْ[2] بِاَخْفَافِهَا[3] وَوَطِئَتْهُمْ بِاَظْلَافِهَا[4] وَقَامَتْ عَلَى سَنَابِكِهَا"[5]

''گویا زمانے کا ستم، ایسا متحرک فتنہ بن چکا تھا، جو بس اپنی من مانی کرنے پر تلا ہوا تھا، جو اُس کی زد میں آجائے اُسے اپنے پیروں تلے روندنے کو بے چین تھا، پنجوں کے بل کھڑا، نئے حملے کے لیے تیار تھا۔''

کیا یہ کوئی نئے فتنے ہیں یا وہی فتنے جن کی طرف سابق الذکر سطور میں اشارہ وہوا ہے؟ بظاہر وہی فتنے ہیں جن کا اب تک تذکرہ ہوتا رہا ہے اور اس مقام پر ان فتنوں کی کچھ خصوصیات اور ان کے مزید اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔ امام المتقینؑ زمانۂ جاہلیت کے فتنوں کو ایک خطرناک وحشی حیوان سے تشبیہ دیتے ہیں، جو اپنے سموں سے اپنے قریب کے افراد کو روند چکا ہے اور اپنے پیروں پر چوکنّا کھڑا ہے کہ اگر مدمقابل کوئی بھی حرکت ہو تو اُسے پوری طاقت سے کچل دے۔

"سنابك" سے مراد ایسے حیوانات کا سُم ہے جو مکمل ایک حصے میں ہے (مراد مضبوط اور طاقتور ہے) اس کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ایسا فتنہ ہے، جسے شکست نہیں دی جا سکتی اور جس کا منحوس سایہ عوام پر حاوی ہے (دراصل ایسے حیوانات اپنے سموں پر اُس وقت کھڑے ہوتے ہیں کہ جب اُنھیں شدید ترین ردِعمل کا اظہار کرنا ہوتا ہے، گویا حالات اور مشکلات اس طرح معاشرے پر مسلط تھے کہ دم گھٹا جا رہا تھا اور سانس لینا دشوار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام علی علیہ السلام نے آخری جملے میں ان حالات سے یہ نتیجہ اخذ فرمایا ہے:

---

[1] سارت: ''سور'' کے مادّے سے بنا ہے۔ بالادستی حاصل کرنا۔

[2] داست: دوس اور دیاس کے مادّے سے ہے۔ معنی پائمال کر دینا۔ فی فتن داستهم، میں دو احتمال پائے جاتے ہیں۔ اول یہ کہ جار و مجرور کا متعلق محذوف ہو۔ اور اس کی تقدیری حیثیت ''والناس فی فتن'' ہو۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ جار و مجرور کا متعلق سابق الذکر جملے موجود سارت کا فعل ہو۔ البتہ پہلا احتمال زیادہ قوی ہو

[3] اخفاف: ''خف'' کی جمع بہ معنی چکمہ۔ اونٹ کے پیر کا نچلا حصہ جو چکمہ کی طرح ہوتا ہے۔

[4] اظلاف: جمع ظلف۔ جانوروں کے سم جو دو ٹکڑوں میں ہوتے ہیں جیسے گائے، بکری وغیرہ کے سُم۔

[5] سنابک: سنبک کی جمع (قنفد کے وزن پر) ایسے حیوان جن کا ایک سُم ہوتا ہے جیسے گھوڑا۔

"فَهُمْ فِيهَا تَائِهُونَ [۱] حَائِرُونَ جَاهِلُونَ مَفْتُونُونَ"

''وہ فتنوں میں سرگرداں، حیران و پریشان اور نادان ودھوکا کھائے ہوئے، حواس باختہ ہو چکے تھے۔''

"تَائِهُونَ" اس طرف اشارہ ہے کہ راہِ حق مکمل طور پر بھول چکے تھے، حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھول گئے تھے۔ "حَائِرُونَ" نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے کہ ذہن ساتھ چھوڑ گیا تھا اور وحشت نے ان کو گھیر لیا تھا، کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کریں اور کدھر جائیں۔

"جَاهِلُونَ" اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اگر نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کر بھی لیں تو بھی جہالت اور بے خبری ان کے راستے میں رکاوٹ تھی۔

"مَفْتُونُونَ" اوہام اور خرافات نے ان کا وہ حال کیا تھا کہ سراب کو حقیقت اور حقیقت کو وہم و گمان سمجھنے لگے تھے (کسی پر اعتبار کرنا ممکن نہ تھا) یہ اُس جگہ کی بات ہے: "فِيْ خَيْرِ دَارٍ [۲] وَشَرِّ جِيْرَانٍ" جہاں بہترین گھر تھا (یعنی خانۂ کعبہ، انبیاؑ کا مقام) لیکن بدترین ہمسائے وہاں رہتے تھے۔ (جو جان، مال، عزت و آبرو کے دشمن اور دین کے نام ونشان کو مٹانے کے لیے تیار تھے) "نَوْمُهُمْ سُهُوْدٌ [۳] وَ كُحْلُهُمْ دُمُوْعٌ" بار بار نازل ہونے والی مصیبتوں کی وجہ سے ان کی نیندیں حرام تھیں اور مسلسل آنکھوں میں آنسو تھے، انہیں ہرگز آرام نصیب نہ تھا۔ مسلسل درپیش مصائب و آلام، ان کی آنکھوں سے آنسو تھمنے نہیں دیتے تھے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ایسی سرزمین پر زندگی بسر کر رہے تھے:

"بِاَرْضٍ عَالِمُهَا مُلْجَمٌ وَجَاهِلُهَا مُكْرَمٌ"

''اس سرِ زمین پر عالم کے منہ میں لگام تھی اور جاہل معزز و سرفراز تھا۔''

ظالموں کے ظلم و جور کی وجہ سے دانشمند خاموشی پر مجبور تھے اور لوگوں کی ہدایت کرنے اور انھیں مشکلات سے نجات دینے سے عاجز تھے۔ جاہل باعزت اور معاشرے پر حاکم تھے۔

مفسرین نہج البلاغہ کے مطابق جملہ "فِيْ خَيْرِ دَارٍ" کی چار مختلف تفاسیر دیکھنے میں آئی ہیں۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ بعض کعبہ اور حرمِ امنِ الٰہی کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں (اس بنا پر کہ مذکورہ بالا تمام جملے زمانۂ جاہلیت کی صفت بیان کرتے

---

[۱] تائھون جمع ہے تائہ کی، جس کے معنی گمشدہ کے ہیں۔

[۲] ''فی خیر دار'' کے جملے میں، بعض افراد نے ''جار و مجرور'' کو ''مفتونون'' سے متعلق جانا ہے، لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس جملے کو ''خبر'' مانتے ہوئے اس کے ''مبتداء'' کو ''محذوف'' مان لیا جائے۔ یعنی جملہ دراصل یوں تھا "والناس فی خیر دار" اور یہ پورا جملہ ''حال'' مان لیا جائے ''عصر جاہلیت'' کے لیے، نیز ''واؤ''، ''وشرّ جیران'' میں، ''مع'' (ہمراہ) کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

[۳] ''سھود'' مصدر ہے، جس کے معنی ''نیند نہ آنا یا نیند کا کم ہو جانا'' ہے۔ (صحاح، مفردات، لسان العرب اور مقائیس اللغۃ)

ہوں) حالانکہ بعض سرزمین شام کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی بزرگ انبیاءؑ کی سرزمین ہے، مگر اُس وقت شام کے لوگ اس زمین کے بدترین ہمسائے تھے (یہ اس صورت میں ہے کہ مذکورہ جملے حضرت علیؑ کے اپنے زمانے پر دلالت کرتے ہوں) تیسرا احتمال یہ ہے کہ مراد ''کوفہ'' ہو، جہاں حضرت علیؑ رہا کرتے تھے۔ چند انگشت شمار منافقوں، عہد شکنوں اور برے ہمسایوں نے اس پاک زمین پر قبضہ جمایا ہوا تھا اور ان جملوں کی چوتھی تفسیر یہ ہوسکتی ہے کہ ''دنیائے فانی'' مراد ہے، جہاں بُرے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ پہلی تفسیر سب سے مناسب اور صحیح معلوم ہوتی ہے، مذکورہ بالا عبارات بھی اسی تفسیر سے مطابقت رکھتی ہیں۔

اس بنا پر ''نَوْمُهُمْ سُهُوْدٌ'' سے لے کر آخر تک کے تمام جملے عصر جاہلیت کی ناامنیوں، پریشانیوں اور اس وقت کے مصائب ومشکلات کی طرف اشارہ ہوں گے۔ عالم وہ پاک افراد تھے کہ جو ظہورِ پیغمبرؐ کے بعد تیزی سے آپؐ کے گرد جمع ہو گئے جبکہ جاہل وہ فاسد، مفسدین قریش اور ان جیسے لوگ تھے، مگر دوسری تفاسیر کی بنا پر امیر شام کے زمانے کی بدامنی اور عراق وشام کی مشکلات مراد ہونگی لیکن یہ احتمال کمزور ہے، کیونکہ یہ تفسیر رُوحِ خطبہ کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں رکھتی۔ اس تفسیر پر گواہ وہ حدیث ہے کہ جسے ابنِ ابی الحدید نے اپنی کتاب میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آغازِ بعثت میں اپنی حالت بیان کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا:

''كُنْتُ فِيْ خَيْرِ دَارٍ وَشَرِّ جِيْرَانٍ''

''میں ایک بہترین گھر میں تھا مگر بدترین ہمسایوں کے درمیان تھا۔'' [1]

امامِ عالی مقامؑ نے دو جملوں میں نہایت سادگی اور روانی کے ساتھ پورے معاشرے کی بے چینی، بے قراری اور نفسیاتی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''نَوْمُهُمْ سُهُوْدٌ، وَ كُحْلُهُمْ دُمُوْعٌ''

''جہاں نیند کے بجائے بیداری اور سُرمے کی جگہ آنسو تھے۔''

یہ تعبیر عصر جاہلیت کی بدامنیوں، اور اس وقت کے مصائب ومشکلات کی طرف ایک لطیف وظریف اشارہ ہے کہ اگر وہ کہیں سو بھی جائے تو ان کی نیند خوف وہراس سے بھرپور اور وحشتناک ہوتی تھی اور پھر مسلسل بے خوابی انہیں جھکڑ لیتی۔ مصائب کا دامن اتنا پھیلا ہوا تھا کہ آنکھوں کی زینت سرمہ کی جگہ ان کے سوزناک اور پے در پے گرنے والے آنسوؤں نے لے لیا تھا جو طرح طرح کی مشکلات اور مصائب کے آئینہ دار تھے۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۱، صفحہ ۱۳۷

یہ فطری بات کہ ایک ایسے تاریک ماحول میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند گنے چنے علماء، جو تنہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یار و یاور تھے، خاموشی اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ جبکہ قریش کے جاہل اور شرک و الحاد کے سردار حضرات نہایت احترام وعزت کی زندگی جی رہے تھے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ عالم سے مراد، وہ چند موحّد اور آگاہ افراد ہوں جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے موجود تھے، جیسے حضرت عبد المطلبؑ، حضرت ابو طالبؑ نیز جناب قس بن ساعدہ اور جناب لبید بن ربیعہ نیز اُن جیسے دیگر بزرگان۔

نکتہ

دورِ جاہلیت میں لوگوں کی بے حس و مردہ زندگی

حضرت امام علی علیہ السلام نے مذکورہ مختصر اور جامع عبارات میں عرب کے زمانۂ جاہلیت کی بے حس زندگی کا خاکہ کھینچا ہے کہ گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے سے انسان اپنے آپ کو بھی اس زمانے میں محسوس کرتا ہے گویا کہ تمام بے سروسامانی اور تنگدستی اور اُس زمانے کی بُرائیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہے۔ مذکورہ بالا بیان کا ایک رخ یہ ہے کہ ایسے معاشرے میں جہاں ہر سو تاریکی چھائی ہوئی ہے، وہاں پیغمبر اسلامؐ کے مقام و مرتبے کی عظمت اور نورِ ہدایت زیادہ واضح اور روشن انداز میں نظر آنا نیز سمجھا جا سکتا ہے، ایسے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمات اور آپؐ کی پاک و پاکیزہ زندگی زیادہ نمایاں اور روزِ روشن کی طرح جگمگاتی اور اپنے اثرات کو منواتی ہے۔ اب ذرا تصور کیجیے کہ ایسے تاریک معاشرے کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تبدیل کرنا تقریباً ناممکن نظر آتا ہے، لہٰذا انسان کو با آسانی یقین آجاتا ہے کہ اگر کوئی طاقت ہے تو وہ صرف معجزے کی قدرت اور وحی کی عظیم طاقت اور دینِ اسلام کے سنہرے اصول اور جامع منشور ہی ہیں جو ایسے معجزانہ اثرات کے حامل ہیں۔

اور دوسرا پہلو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مولائے متقیانؑ کے زمانے میں (رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ بند ہوتے ہی) آداب و افکارِ اسلامی تبدیل ہونے لگے اور جاہلیت کے زمانے کا مزاج دوبارہ نمایاں ہونا شروع ہو گیا تھا، یہ سب کچھ، خلفاء کے زمانے میں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے منہ موڑنے کے نتیجے میں ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ عالمِ انسانیت کا یہ عظیم معلّم اپنے ہر لفظ میں سراپا فریاد ہے۔ اپنے زمانے کے عوام کو غفلت سے بیدار کرتا، اُن کی آنکھوں کو حقیقت سے آشنا کرتے ہوئے یوں گویا ہوتا ہے کہ ''زمانۂ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تم کہاں تک پہنچ چکے تھے اور آج کہاں تک گر چکے ہو''۔

اسلامی معاشرہ، چاروں طرف سے خطروں میں گھر چکا ہے اور روحِ جاہلیت ایک بار پھر پوری طرح بیدار ہونے کو ہے، جاگو کہ وقت ہاتھ سے جانے کو ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ امامِ برحق، اس خطبے کو جنگِ صفین سے واپسی پر بیان فرما رہے ہیں۔ موضوع ''جنگ میں (ظاہری) ناکامی'' ہے۔

عربی اور فارسی کا مشہور محاورہ ہے: ''اِیَّاکَ اَعْنِیْ وَ اسْمَعِیْ یَا جَارَۃُ'' ''یعنی اے لوگو! اے میرے ہمسائے میں رہنے والو! میں تم سے مخاطب ہوں۔ میری بات غور سے سنو! اور اچھی طرح سمجھ لو'' یہ ایک کنایہ اور قابلِ فہم بیان ہے۔ جس کے ذریعے اپنے ہمدروں کو خبردار کر رہے ہیں۔

یہ انسانی ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والے جملوں کا مطالعہ، آج ہم مسلمانوں کے لیے، اور جو کچھ آج کی دنیا نیز مغربی تہذیب وثقافت میں ہوتا نظر آ رہا ہے، جنہیں مشین کے پرزوں کی طرح جکڑ دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت لمحۂ فکریہ ہے۔ اس لیے کہ یہ لفظ بہ لفظ، آج کی مادّی دنیا کے حالات ومسائل کے عین مطابق نظر آتا ہے۔ آج بھی لوگ فتنوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، ایمان اور یقین کی بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں۔ اَخلاقی بُرائیوں کی آلودگیوں اور بظاہر ہر آراستہ لیکن زہریلی معلومات کی سج دھج میں، حق کی شناخت تک جانے والے راستے کہیں کھو گئے ہیں۔ لوگوں کا نظامِ زندگی درہم برہم ہو چکا ہے، فتنہ وفساد سے دامن بچانا مشکل ہو چکا ہے، گمراہی اور تاریکی نے ہر جگہ اپنا ڈیرہ ڈال رکھا ہے اور ''ہدایت کا کام'' بھولی بسری داستان بن چکا ہے۔ نتیجہ یہ کہ فسق وفجور نے انسانی معاشرے کو اچھی طرح سے جکڑ لیا ہے اور اب ساری دنیا شیاطین کے ہاتھ میں ایک کھلونے کی طرح ہے۔

جی ہاں! مولائے کائناتؑ کے زمانے میں، غفلت زدہ عوام نے ایک بار پھر جاہلانہ معیاروں کو اپنا لباس بنا لیا تھا اور اب ہمارا معاشرہ بھی ایسا ہو چکا ہے، لیکن انتہائی تعجب کی بات یہ ہے کہ اُس زمانے کے لوگ کچھ اس طرح خوابِ غفلت میں ڈوب گئے تھے کہ سوائے ایک خاص گروہ کے، کسی پر اِس عظیم معلم کی دل خراش فریادوں کا اثر نہ ہوا، وقت گزرتا گیا اور ایک کے بعد زمانۂ جاہلیت کے رسم ورواج زندہ ہوتے گئے، آخر کار وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔

اسلامی حکومت خلافت بنی امیہ اور بنی عباس کی شکل اختیار کر گئی؛ نہ صرف دنیا میں اسلام کی پیش قدمی رک گئی، بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے پیکر کو شدید ترین دھچکے لگے۔

اس موضوع کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بہت مناسب ہوگا کہ ہم مختلف زاویوں سے، زمانۂ جاہلیت میں عوام الناس کے حالات ومسائل کا زیادہ گہری نظر سے جائزہ لیں اور حضرت امیر المومنینؑ نے اپنے چھوٹے چھوٹے جملوں میں

سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی مثال کے عین مطابق جو کچھ فرمایا ہے، اُس کو مزید وضاحت کے ساتھ ہم آیاتِ قرآنی اور تاریخ کے صفحات سے با آسانی سمجھ سکتے ہیں۔

عرب کی جہالت اور دوسری قوموں میں موجود اُس سے ملتی جلتی جہالتوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دراصل غلط رسم ورواج، عادات واطوار، باطل عقائد اور خرافات، بے شرمی اور بیہودہ مزاج نیز انتہائی سنگدلانہ برتاؤ کا مجموعہ تھا۔ پتھر اور لکڑی سے بُت تراشتے اور اُن کی پرستش کرتے، مشکلات میں اُن ہی سے پناہ مانگتے اور پھر ان بے شعور چیزوں کو خدا کی بارگاہ میں اپنا شفاعت کرنے والا نیز اُن کو زندگی کے تمام اُمور، خوش نصیبی اور بدنصیبی، اور خیر وشر پر حاکم سمجھتے اور مانتے تھے۔

اپنی عزت وناموس کی حفاظت کے بہانے نہ صرف اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے بلکہ لڑکوں کو بھی قتل کرنا اور بتوں پر نذر کے طور پر قربان کر دینا اُن کے دین کا حصہ تھا اور کبھی فقر وفاقہ اور تنگ دستی[۱] بھی اس قسم کی بے رحمی کا باعث بنتی تھی۔ ''سونے پہ سہاگہ'' یہ کہ اپنی ان بدکرداریوں کا ان کو کوئی افسوس نہ تھا بلکہ اپنے ایسے اعمال پر فخر ومباہات کیا کرتے اور اُن کو اپنے خاندان کی مثبت اور منفرد صفات شمار کرتے تھے۔ اُن کی نماز اور راز ونیاز کا انداز یہ تھا کہ مسلسل تالیاں پیٹتے اور سیٹیاں بجاتے تھے، یہ تمام کام خانۂ کعبہ میں انجام پاتے، حتیٰ کہ ان کی خواتین اکثر بالکل برہنہ حالت میں کعبے کا طواف کرتیں اور ان نازیبا حرکات کو عبادت شمار کیا جاتا تھا۔[۲] جنگ، خون خرابہ اور غارت گری ان لوگوں کے لیے، فخر و مباہات کا باعث تھی، (خلافِ انسانیت، طاقت کا استعمال) اور جہاں تک عورت کی شخصیت کی بات تھی، تو وہ ''ایک بے قیمت مال'' سمجھی جاتی تھی، بنیادی انسانی حقوق سے بھی اُس کو محروم کر رکھا تھا، حتیٰ کہ جوئے کے طور پر اُس پر شرط بھی لگائی جاتی تھی۔

"وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَهُ وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُوْنَ"[۳]، "اَمْ خَلَقْنَا الْمَلَآئِكَةَ اِنَاثاً وَّهُمْ شَاهِدُوْنَ"[۴]

غضب خدا کا! انہوں نے اللہ کے فرشتوں کو ''خدا کی بیٹیاں'' قرار دیا تھا اور گھر میں لڑکی کے پیدا ہونے کو اپنے لیے ننگ وعار سمجھتے تھے۔ انھوں نے خود ساختہ خرافات پر مبنی دین بنایا ہوا تھا (اپنے مفادات کے مطابق) جس میں ایک

---

[۱] سورۂ انعام، آیت ۱۳۷، سورۂ اسراء، آیت ۳۱، سورۂ تکویر آیت ۸

[۲] سورۂ انفال، آیت ۳۵۔ سورۂ برأت کی معروف ومشہور شانِ نزول میں یہ بات موجود ہے کہ ''حضرت علیؑ جہاں اور بہت سے کاموں کے ذمے دار تھے، وہاں یہ حکم بھی خدا کی جانب سے ان کو انجام دینا تھا کہ ''حج کے زمانے میں، عریاں حالت میں طواف سے، لوگوں کو منع کیا جائے۔'' ولا یطوفن بالبیت عریان'' تفسیر نور الثقلین، جلد ۲، صفحہ ۱۷۹ تا ۱۸۱، حدیث ۱۴، ۱۷، ۱۸، ۲۰، تفسیر مجمع البیان، جلد ۵، ص ۳۔

[۳] سورۂ نحل، آیت ۵۷

[۴] سورۂ صافات، آیت ۱۵۰

بات یہ بھی تھی کہ حیوانات کے شکم میں جو بچے ہیں۔ وہ ہم مردوں کا حصہ ہیں اور ہماری بیویوں پر وہ حرام ہیں۔ ہاں اگر وہ مردہ پیدا ہوئے تو پھر سب اُس میں شریک ہو سکتے ہیں۔ [۱] جب اپنی بیویوں سے جھگڑا ہوتا اور اُن پر اپنے غصے کا اظہار کرنا ہوتا تو ''ظہار'' کرتے، یعنی بس اتنا ہی کافی تھا کہ بیوی سے کہتے، "اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّی" ''تیری نسبت مجھ سے ایسی ہی ہے جیسے میری ماں۔''

یہ گفتگو اُن کی نظر اور عقیدے کے مطابق باعث بنتی کہ اُس کی بیوی، اُس کی ماں کی حیثیت اختیار کرے اور اس پر حرام ہو جائے، دوسرے لفظوں میں بغیر طلاق کے طلاق سمجھی جائے اور وہ عورت ایک سزا کے طور پر بطور مطلق غیر واضح صورتِ حال کا شکار رہے اور اُسے معلوم نہ ہو کہ اب کیا کرنا ہے۔ [۲] زمانۂ جاہلیت کی ایک دردناک رسم اور خاصیت یہ تھی کہ جنگ، خون خرابہ اور کینہ پروری، خاندانوں اور قبائل میں نسل در نسل چلتی رہتی تھیں۔ باپ، اپنے فرزندوں کے لیے لڑائی جھگڑوں کو وارث میں چھوڑ کر جاتا تھا۔ ایسا بدبختی اور بربادی والا ماحول، جس کی قرآن تصویر کشی کرتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

"وَاذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَ کُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْهَا"

''اللہ کی اُس عظیم نعمت (احسان) کو پہچانو جو اُس نے تم لوگوں پر عطا فرمائی، یاد کرو جب تم آپس میں دشمن تھے، خدا نے تمہارے دلوں میں اُلفت پیدا کر دی اور خدا کی نعمت کی برکت سے تم بھائی بھائی ہو گئے، تم تو آگ کے دہانے پر کھڑے تھے کہ اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔'' [۳]

عرب کے باطل عقائد میں سے کچھ یہ بھی تھے کہ وہ بارش کے ہونے کو خاص قسم کے ستاروں کے طلوع اور غروب ہونے سے ربط دیتے تھے، پرندوں کے ذریعے نیک اور بد کی فالیں نکالتے تھے۔ وہ جنگل و بیابان میں ''دیو'' کے ہونے پر ایمان رکھتے تھے اور ان جیسے نہ جانے کتنے خام قسم کے خیالات ان کے ذہنوں پر حاوی تھے۔ ایسی تمام باتوں کے مجموعے کو قرآن مجید میں ''ضلالِ مبین'' کا عنوان دیا گیا ہے یعنی ''واضح اور کھلی گمراہی''۔ سبحان اللہ! کیا روشن اور بولتی ہوئی زبان ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ

---

[۱] سورۂ انعام: آیت ۱۳۹

[۲] سورۂ احزاب: آیت ۴، سورۂ مجادلہ: آیت ۲

[۳] سورۂ آلِ عمران: آیت ۱۰۳

وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ "[۱]

''وہی تو ہے جس نے مکہ والوں میں ان ہی میں کا ایک رسولؐ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور عقل کی باتیں سکھاتے ہیں اگر چہ اس کے پہلے تو یہ لوگ صریحی گمراہی میں (پڑے ہوئے) تھے۔''

ہاں! تو یہ تھی جاہلیت عرب کی داستان (اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں) اور بالکل ایسی ہی ہیں (معمولی فرق کے ساتھ) گزشتہ صدیوں اور زمانوں کی جاہلیت کی اصل علامات، جن کی شکلیں مختلف ہیں، مگر روح اور مزاج ایک ہیں۔

یہاں سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کام کی اہمیت اور عظمت نیز قرآنِ مجید کے ''معجزانہ بیان و تاثرات'' کا اندازہ ہوتا ہے، جس کا عاجزانہ اعتراف کرتے ہوئے مغرب کا مشہور زمانہ فلسفی و تاریخ دان ''تھامس کارل'' کہتا ہے: ''خدا نے عرب کی، اسلام کے ذریعے کایا پلٹ دی، تاریکی سے روشنی کی طرف اُن کی ہدایت کی، ایک خاموش، جمود کی شکار قوم کو اس طرح خوابِ غفلت سے بیدار کیا کہ اُن کی گمنامی، شہرت میں بدل گئی، سستی کی جگہ حرکت نے لے لی، پست ترین لوگ عرش اعلیٰ پر نظر آئے، عاجزی اور ناتوانی، طاقت و قوت کی مثال بن گئی۔ ظہورِ اسلام کے ذریعے ان کے نور سے دنیا کے چاروں گوشے جگمگا اُٹھے۔ ایک صدی گزرنے نہ پائی تھی کہ مسلمانوں کا ایک پیر ہند میں تھا تو دوسرا اُندلس کو روندرہا تھا۔ آخر کار اسی مختصر مدت میں، اسلام کا نور آدھی دنیا کی آنکھوں کو چکا چوند کر چکا تھا۔[۲]

تیسرا حصّہ

"وَمِنْهَا يَعْنِي آلَ النَّبِيِّ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ:

هُمْ مَوْضِعُ سِرِّهِ وَلَجَأُ أَمْرِهِ وَعَيْبَةُ عِلْمِهِ وَمَوْئِلُ حُكْمِهِ وَكُهُوفُ كُتُبِهِ وَجِبَالُ دِينِهِ بِهِمْ أَقَامَ انْحِنَاءَ ظَهْرِهِ وَأَذْهَبَ ارْتِعَادَ فَرَائِصِهِ.

''یہ لوگ رازِ الٰہی کی منزل اور امرِ دین کا ملجا و ماویٰ ہیں۔ یہی علم خدا کے مرکز اور حکم خدا کی پناہ گاہ ہیں۔ کتابوں نے یہیں پناہ لی ہے اور دین کے یہی کوہ گراں ہیں۔ انہیں کے ذریعے پروردگار نے دین کی ٹیڑھی پشت کو سیدھا کیا ہے اور انہیں کے ذریعے اس کے جوڑ بند کے رعشے کا علاج کیا ہے۔''

---

[۱] سورۂ جمعہ: آیت ۲

[۲] ''محمدؐ اور قرآن کی بارگاہ میں عرضِ معذرت'' صفحہ ۷۷ ''نقل از تفسیر نمونہ، جلد ۳، ص ۱۳۱''

شرح وتفسیر

آلِ محمد علیہم السلام کا عظیم رتبہ

امامؑ جنّ و بشر، خطبے کے اس حصّے میں، خاندان پیغمبرؐ اور آئمہ اہلبیت علیہم السلام کی توصیف بیان فرماتے ہیں، گویا چھوٹی چھوٹی عبارتوں میں حوضِ کوثر چھلکتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد، عالم اسلام میں خاندانِ عصمت وطہارت کا مقام کیا تھا؟ چنانچہ امیر المومنینؑ تسلسل کے ساتھ آٹھ جملوں میں، وہ سب کچھ بیان فرمارہے ہیں جو ''حدیث ثقلین، حدیث سفینۂ نوح علیہ السلام اور حدیث نجوم'' میں موجود ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ اُس کی تفصیل کیا ہے؟ [۱]

پہلے چھے (۶) جملوں میں ارشاد ہوتا ہے:

هُمْ مَوْضِعُ سِرِّهِ، وَلَجَأُ [۲] اَمْرِهِ، وَعَيْبَةُ [۳] عِلْمِهِ وَمَوْئِلُ [۴] حُكْمِهِ، وَكُهُوْفُ كُتُبِهِ، [۵] وَجِبَالُ دِيْنِهِ [۶]

''وہ ہستیاں، اسرار خدا کا مرکز، اُس کے فرمان کی پناہ گاہ، علم الٰہی کے ظرف، اُس کے احکام کا مقام اور آسمانی

---

[۱] مشہور احادیث جو شیعہ اور سنی کتب اور منابع و ماخذ اصلی میں بیان ہوئی ہیں۔ اُن میں مقامِ اہل بیتؑ کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ حدیثِ ثقلین میں اہلِ بیتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو، قرآن کے بعد ہدایت کا سب سے اہم وسیلہ اور نجات کا باعث بتایا گیا ہے، نیز یہ کہ قرآن اور اہلِ بیتؑ کبھی بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے ہیں۔ دوسری حدیث، ''حضرتِ نوحؑ کی کشتی سے تشبیہ'' کے بارے میں ہے کہ یہ کشتی طوفان کے وقت ڈوبنے سے بچاؤ کا واحد وسیلہ تھی اور تیسری حدیث میں ''اہل بیت علیہم السلام کو آسمان کے ستاروں سے تشبیہ دی ہے''۔ کیونکہ آسمان کے ستارے (خشکی اور پانی میں تاریک راتوں میں) ہدایت اور راستے کی شناخت کا اہم وسیلہ سمجھے جاتے ہیں۔

[۲] ''لجا'' اور ''ملجا'' کے معنی پناہ گاہ ہیں۔

[۳] ''عیبۃ''، یعنی صندوق یا ایسی چیز جس میں کچھ چھپایا جا سکے۔ اصل میں یہ مادّۂ ''عیب'' سے لیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ عام طور سے ''عیوب'' کو چھپایا جاتا ہے، لہٰذا یہ اصطلاح اس معنی کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

[۴] ''موئل'' ''وال'' کے مادّے سے (بروزن سھل) ہے، جس کے معنی ہیں ''پناہ گاہ اور نجات کی جگہ''

[۵] توجہ رہے کہ ان (چھے) جملوں اور ان کے بعد والے جملے کے مرجع ضمیر کے بارے میں بھی، نہج البلاغہ کے شارحین کے درمیان بحث وگفتگو ہے۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ ''سارے ضمیر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اشارہ ہیں، لیکن قرائن سے بخوبی پتا چلتا ہے کہ پہلے (چھے) جملے، خدا کی طرف (بالخصوص، وکھوف کتبہ کی بنیاد پر) اور آخری جملے میں ضمیر ''دین'' کی طرف اشارہ ہے، اس کی وضاحت آگے آئے گی۔

[۶] ''کھوف'' جمع ہے ''کھف'' کی، اس کے معنی ''غار'' ہیں، بعض کی رائے ہے کہ اس کے معنی ''ایک وسیع غار'' ہیں۔ قدیم زمانے میں کیونکہ عام طور سے انسان غاروں میں رہتا اور وہاں پناہ لیتا تھا، اس لیے اس لفظ میں ''پناہ گاہ'' اور ''محفوظ جگہ'' کا مفہوم موجود ہے۔

کتابوں کی حفاظت گاہ نیز دین کے لیے مستحکم پہاڑوں جیسی شان کی حامل ہیں۔''

بعض دانشمندوں اور صاحبانِ علم نے، مذکورہ بالا بعض جملوں کو معنی کے لحاظ سے مترادف اور مشابہ کہا ہے، لیکن، ہماری نظر میں حق یہ ہے کہ ہر ایک کے اپنے خاص معنی مراد ہیں اور اس میں علم کے نایاب موتی پنہاں ہیں۔

پہلے جملے میں یہ حقیقت ہے کہ ''اسرارِ الٰہی، اہل بیت علیہم السلام کے پاس ہیں'' ظاہری بات ہے کہ جس کے شانوں پر دینِ الٰہی کی رہبری اور راہنمائی جیسے اہم فریضے کا بوجھ ہے، اُس کے لیے ضروری ہے کہ تمام اَسرار سے واقف ہو، کیونکہ اُس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہدایت، تدبیر اور پورے نظام کے فرائض صحیح طرح سے، مناسب منصوبہ بندی کے ساتھ، بخیر وخوبی انجام پاسکیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ ان ہستیوں کی رہبری اور ہدایت کی ذمہ داری کا دائرہ کسی ایک زمانے تک محدود نہیں بلکہ پوری تاریخِ انسانیت پر محیط ہے۔ (پیغمبر اکرمؐ اور آپؐ کے معصوم جانشینوں کی علمِ غیب کی خاصیت کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ علم غیب کا ایک حصہ بالخصوص رہبری کی بنیاد ہے، نیز اس کے بغیر، رہبری کا کام ناقص ہوکر رہ جاتا ہے)۔ [1]

دوسرے جملے سے مراد یہ ہے کہ اہل بیت علیہم السلام حکمِ خدا کی پناہ گاہ ہیں۔ اور کیوں کہ حکم دو طرح کے ہیں: ''حکم تکوینی'' اور ''حکم تشریعی'' تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں کیا صرف ''حکم تشریعی'' مراد ہے یا دونوں مراد ہیں؟ پہلے اور بعد کے جملوں کا ظاہر یہ بتاتا ہے کہ مراد صرف ''احکام تشریعی'' ہیں، کیونکہ عوام النّاس کو پابند کیا جارہا ہے کہ ''ان احکام کو حاصل کرنے اور اُن کے مطابق عمل کرنے کے سلسلے میں ضروری ہے کہ اہل بیتِ پیغمبرؐ کی پناہ حاصل کی جائے۔

تیسرے جملے سے مراد یہ ہے کہ اہلِ بیت علیہم السلام خدا کے علوم کا مخزن ہیں۔ یعنی اگر علم (حقیقی) کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اہلِ بیت عصمت وطہارت علیہم السلام کی شخصیات کا دائرہ صرف ''اَسرار'' اور ''احکام'' تک محدود نہ تھا بلکہ انسانوں کی ہدایت کے لیے جن تمام علوم کا ہونا ضروری ہے یا دوسرے الفاظ میں ''عالمِ بشریت کی ہدایت کے تمام ذرائع اور وسائل کا ماہرِ فن اگر کوئی ہے تو وہ صرف اہلِ بیتؑ ہیں''۔

چوتھے جملے سے مراد یہ ہے کہ اہلِ بیت علیہم السلام احکامِ الٰہی کے مرجع ہیں، یعنی عوام الناس اپنے تمام مسائل اور اختلافات کے حل کے لیے، چاہے وہ فکری مسائل ہوں یا عدالت وقضاوت کی بنیاد پر اختلافات کا حل پیش کرنا ہو، معاشرہ اپنے جملہ معاملات میں، اہلِ بیت علیہم السلام کی طرف رجوع کرنے کا پابند ہے، تاکہ اُن کی روزمرہ زندگی آسودہ ہوسکے اور اگر ''موئل حِکَمِہٖ'' (حکم بروزن اِرَم، جو حکمت کی جمع ہے) پڑھا جائے تو پھر اس جملے کا فرق اس سے پہلے والے جملوں سے مزید واضح اور روشن ہوجاتا ہے، کیونکہ پھر مراد یہ ہوگی ''کہ احکامِ الٰہی کے فلسفے اور حکمتیں کیا ہیں؟'' جو کہ پیغمبر اسلامؐ اور

---

[1] تفسیر پیام قرآن، ج ۷، ص ۲۵۔ تفسیر نمونہ، ج ۲۵، ص ۱۴۲۔ ذیل آیت ۲۶ سورۂ جن

آپؑ کے معصوم جانشینوں کے علوم کا ایک اہم حصہ شمار ہوتی ہیں۔

پانچواں جملہ: "وَ کُهُوْفُ کُتُبِهٖ" اس حقیقت کو بیان کر رہا ہے کہ ''تمام الٰہی (آسمانی) کتب کے ظاہر و باطن اہل بیت علیہم السلام کے پاس ہیں، اس سے ملتا جلتا ایک بیان اور بھی ہے، جس میں حضرت امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَمَا وَاللّٰهِ لَوْ ثُنِيَتْ لِيْ وِسَادَةٌ فَجَلَسْتُ عَلَيْهَا لَاَفْتَيْتُ اَهْلَ التَّوْرَاةِ بِتَوْرَاتِهِمْ... وَ اَفْتَيْتُ اَهْلَ الْاِنْجِيْلِ بِاِنْجِيْلِهِمْ... وَ اَفْتَيْتُ اَهْلَ الْقُرْآنِ بِقُرْآنِهِمْ"[1]

''خدا کی قسم! اگر میرے لیے کوئی مسند تیار کی جائے، جس پر میں بیٹھا کروں (اور لوگوں کے مسائل کا حل پیش کروں) تو اہلِ توریت کو اُن کی کتاب کے مطابق، انجیل کے پیروکاروں کو اُن کی کتاب سے اور اہلِ قرآن کو عین قرآن کے مطابق (خدا کا حکم بیان کروں گا اور) فتویٰ دوں گا۔''

چھٹے جملے سے مراد یہ ہے کہ اہلِ بیت علیہم السلام دین کے فلک بوس پہاڑ ہیں۔ بظاہر قرآن مجید کی اُن آیات کی طرف اشارہ ہے، جن میں پہاڑوں کا ذکر آیا ہے اور زمین کو متوازن رکھنے میں، اُن کا اہم کردار، نیز ان پر برکات کا نزول جیسے موضوعات بھی زیرِ بحث آئے ہیں۔ سورۂ نحل میں ہم پڑھتے ہیں:

"وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ اَنْهٰرًا وَ سُبُلًا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ"[2]

''اور اسی نے زمین پر (بھاری بھاری) پہاڑوں کو گاڑھ دیا تاکہ (ایسا نہ ہو) زمین تمہیں لے کر کہیں جھک جائے (اور تمہارے قدم نہ جمیں) اور (اسی نے) ندیاں اور راستے بنائے تاکہ (تم اپنی اپنی) منزل مقصود تک پہنچو۔''

اس آیت اور اس سے ملتی جلتی آیات میں، ''پہاڑوں کی حکمت'' کو بیان کیا گیا ہے۔ جہاں یہ پہاڑ زمین کے اندر اور باہر سے وارد ہونے والے مختلف دباؤ سے نظامِ زمین کو بچاتے اور زمین کو توازن کی حالت میں برقرار رکھتے ہیں، وہاں پہاڑ ایک بہت بڑا ذریعہ اور سبب ہیں، نہروں اور چشموں کے جاری ہونے کا اور تیسری حکمت یہ ہے کہ یہ (فلک بوس) پہاڑ اپنے اندر انواع و اقسام کی معدنیات کو ذخیرہ کیے ہوئے ہیں (جن کے بارے میں معلومات کا حاصل کرنا بجائے خود علم کا ایک اہم شعبہ بن چکا ہے، جو نہ جانے انسانی زندگی کے کتنے شعبوں کو چلا رہی ہیں اور دنیا بھر میں اقتصادیات کا نہایت اہم ستون ہیں) بالکل اسی طرح بلکہ اس مثال سے بھی کہیں زیادہ، روحانی اور مادّی فوائد ''معصومینؑ کے وجودِ بابرکات'' کے اس دنیا اور اُس میں رہنے والے انسانوں پر ہیں، ان ہستیوں کے ہونے سے انسانی افکار و خیالات کی دنیا میں ایک توازن اور سکون کی

---

[1] بحار الانوار، ج ۱۰، ص ۱۱۸، حدیث ۱

[2] سورۂ نحل، آیت ۱۵۔ مزید معلومات کے لیے تفسیر نمونہ کی، ج ۱۱، آیت ۱۵، کے ذیل کا مطالعہ فرمائیں۔

کیفیت پائی جاتی ہے۔ دلوں کو اطمینان میسر آتا ہے اور یہ معصومینؑ معدنِ علم و حکمت کے گراں بہا ذخائر ہیں، جن سے اُمّتِ مسلمہ لحظہ بہ لحظہ سیراب ہو رہی ہے۔ [۱]

کیا بہترین تشبیہ ہے، ان علم و معرفت سے بھرپور (چھے) جملوں کے بعد، مزید دو جملوں کا اضافہ کرتے ہوئے امام علیؑ فرماتے ہیں:

بِهِمْ اَقَامَ انْحِنَاءَ ظَهْرِهِ، وَاَذْهَبَ ارْتِعَادَ [۲] فَرَائِصِهِ [۳]

''ان ہستیوں (آئمہ اہل بیت علیہم السلام) کے وسیلے سے دینِ اسلام نے اپنا قد بڑا کیا ہے اور اُس کی کمر سیدھی ہوئی ہے، اور دین کے پیکر سے رعشہ، تزلزل اور وحشت کو دُور کیا گیا ہے''۔ (جس طرح پہاڑوں نے زمین کا توازن برقرار رکھا ہے)

''اِنْحِنَاءَ ظَهْرِهِ'' پشت کا خمیدہ ہونا، عربی میں اسے کنائے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، جس طرح ایک انسان پر بہت زیادہ بوجھ لاد دیا جائے تو اُس کی کمر جھک جاتی ہے، بالکل اسی طرح دین کے سلسلے میں دانا دشمن اور نادان دوستوں کی جانب سے مشکلات کا ایک غیر معمولی دباؤ ہوا کرتا ہے، یہ محترم ہستیاں، اُن مشکلات کا سدباب کرتی ہیں، اور دین پر اس دباؤ کے اثرات کی روک تھام کرتی ہیں تاکہ دین کی کمر خمیدہ نہ ہونے پائے، یعنی دین کی اصل شکل و صورت، اس کے اصول اور فروع میں کسی قسم کا بگاڑ پیدا نہ ہو۔

''اِرْتِعَادَ فَرَائِص''، ''بدن کے اُس حصے میں لرزش کا ہونا، جس نے دل کے حصّے کو ڈھانپا ہوا ہے'' یہ بھی عربی زبان کا ایک ''بہترین کنایہ'' ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ ایسی وحشت اور اضطراب کی کیفیت جو دین (اسلام) کی مخالفت میں، بے دینوں اور غیر مذہب والوں کی طرف سے اعتراضات و شبہات نیز الزامات اور تہمتیں لگائی جاتی ہیں، البتہ، آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کے ذریعے ان کے اثرات کو ناکارہ بنا دیا جاتا ہے اور پھر اطمینان کی پہلے والی کیفیت پھر سے پیدا ہو جاتی ہے۔

---

[۱] تفسیر نمونہ: جلد ۱۱، آیت ۱۵، کے ذیل میں، سورۂ نحل میں رجوع کیجیے۔

[۲] ''ارتعاد'' رعدۃ، کے مادّے سے ہے۔ اس کے معنی ہیں ''رعشہ'' اور کیونکہ بادلوں کے آپس میں ٹکرانے کی وجہ سے غیر معمولی آواز سے شدید لرزش پیدا ہوتی ہے، اس لیے اسے ''رعد'' کہا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ارتعاد کے معنی ارتعاش کے ہیں۔

[۳] ''فرائص'' جمع ہے ''فریصہ'' کی۔ یعنی گوشت کا وہ ٹکڑا جو دل کے ساتھ جڑا ہوتا ہے اور خوف اور وحشت کے وقت لرزنے لگتا ہے لہٰذا ''ارتعاد الفرائص'' وحشت اور اضطراب کے لیے کنائے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ نیز فرصت کو اس لیے فرصت کہتے ہیں کہ یہ وقت کا ایک ایسا دورانیہ ہے جو مطلوبہ کام کے لیے مناسب ہے۔ (مقائیس، مفرداتِ راغب اور لسان العرب)

چند اہم نکات

۱۔ خاندانِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امتِ اسلامی کی پناہ گاہ

مذکورہ بالا جملوں میں یقیناً کسی قسم کا مبالغہ نہیں۔ یہ وہ حقائق ہیں، جن کی گواہی معصوم اماموں کی زندگی دے رہی ہے۔ خاص طور سے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام، حضرت امام محمد باقر علیہ السلام، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام ایسے حالات اور واقعات کی منہ بولتی تصویریں ہیں، ان اماموں نے بالخصوص اور تمام معصومین علیہم السلام نے بالعموم اپنے اپنے زمانوں میں مسلسل اصلاح کا کام جاری رکھا، کیوں کہ جیسے جیسے اسلام پھیلتا گیا، اور اُس میں دوسری قوموں کی طرف سے انحرافی خیالات، نظریات کا اضافہ بھی ہوتا گیا، نیز اسلام سے متعلق من مانی تشریح اور غلط تفسیروں کی شکل میں اسلامی تعلیمات میں غیر معیاری افکار کو داخل کیا گیا۔

یہ ایک طبعی عمل بھی تھا اور اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے منافق نیز مفاد پرست عناصر نے بھی بگاڑ پیدا کرنے کی بھرپور کوششیں کیں، لیکن نظامِ امامت نے ہر قدم پر اپنے قول و فعل سے خالص اسلام کو ہر طرح کی تحریف سے پاک رکھا اور حقیقت اسلام کو مسخ ہونے سے بچائے رکھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ان دین کے ستونوں (آئمہ معصومین علیہم السلام) سے جب کوئی سوال کیا گیا، اعتراض اُٹھایا گیا یا شکوک و شبہات کو اُبھارا گیا تو اُس کا منطقی اور بروقت جواب دے کر سائل کی تشفّی کی گئی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت ہوتے ہی، ایسے ہولناک طوفانوں نے سر اُٹھایا تھا کہ اگر خدا کے یہ عظیم لنگر (جانشینِ پیغمبرؐ) نہ ہوتے تو حقیقی اسلام کی کشتی کو ڈوبنے سے کوئی بچانے والا نہ تھا۔

ان عظیم ہستیوں نے اسلام کے دفاع میں اپنا سب کچھ لٹا دیا، بعض موقعوں پر علوم اور دانش کے ذریعے، بعض جگہوں پر رازوں پر سے پردہ اُٹھاتے ہوئے نیز حقائق اسلام کی اصل تصویر دکھاتے ہوئے تو، بعض حسّاس مواقع پر اپنے خون کی بے مثال قربانی پیش کرتے ہوئے حکم قرآن اور سیرت و سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و آلِ رسول علیہم السلام کو زندۂ جاوید کرتے ہوئے، حقیقتِ دین کا لوہا منوایا اور تمام ظاہری و باطنی دشمنوں نیز سازشیوں کے چہروں سے نقابیں نوچ کر پھینک دیں، جس کی مثال حضرت امام حسین علیہ السلام نے میدانِ کربلا میں رہتی دنیا تک کے لیے قائم کر دی۔ آیئے ایک چھوٹا سا موازنہ کرتے ہیں، ''ملل و نحل کے موضوع پر'' آج تک جو کتابیں موجود ہیں، اُن میں موجود افکار اور منحرف اعتقادات کو سامنے رکھیں اور اُن کے مقابلے میں آئمہ معصومین علیہم السلام کے علوم و معارف نیز عقائد و افکار کو سامنے رکھیں، جن کے نمونے ''نہج البلاغہ''، ''صحیفہ

سجادیہؒ ''ہیں۔ان میں موجود اعلیٰ مضامین کی مثال نہیں ملتی۔اس کے علاوہ جو کچھ ''اہل بیت رسول علیہم السلام کی احادیث'' میں سچائی کی روشنی نظر آرہی ہے اور ''توحیدِ شیخ صدوقؒ'' اور اُس جیسی سیکڑوں کتابوں میں محفوظ ہے، اگر ان علوم وحقائق سے ذہنوں کے لیے کچھ روشنی حاصل کی جائے تو با آسانی مذکورہ بالا بیان اور معصومینؑ کی صفات پر ایمان لایا جاسکتا ہے۔یہ وہی چیز ہے، جسے ''حضرت علیؑ کی کمیلؓ بن زیاد سے گفتگو'' کے مختلف حصّوں سے سمجھا اور اخذ کیا جاسکتا ہے۔

آپؑ فرماتے ہیں:

''اَللّٰهُمَّ بَلٰى لَا تَخْلُو الْاَرْضُ مِنْ قَائِمٍ لِلّٰهِ بِحُجَّةٍ اِمَّا ظَاهِرًا مَشْهُوْرًا اَوْ خَائِفًا مَغْمُوْرًا لِئَلَّا تَبْطُلَ حُجَجُ اللّٰهِ وَبَيِّنَاتُهُ... يَحْفَظُ اللّٰهُ بِهِمْ حُجَجَهُ وَبَيِّنَاتِهِ حَتّٰى يُوْدِعُوْهَا نُظَرَاءَهُمْ وَ يَزْرَعُوْهَا فِيْ قُلُوْبِ اَشْبَاهِهِمْ''

''جی ہاں! زمین ہرگز ایسی ہستی سے خالی نہیں رہ سکتی کہ جو خدا کی حجت (نشانی) کے ذریعے قیام کرے، خواہ ظاہر اور آشکار ہو یا خائف اور پنہاں ہو، یہ اس لیے ضروری ہے تاکہ دلائلِ الٰہی اور خدا کی روشن نشانیاں کہیں غلط نہ سمجھی جانے لگیں۔خداوند تعالیٰ اُن (آئمہ معصومین علیہم السلام) کے واسطے سے اپنی حجت اور نشانیوں کو محفوظ رکھتا ہے، تاکہ وہ افراد پھر اپنے جیسوں تک خدا کی نشانیوں کو پہنچادیں اور ان حقائق کے بیجوں کو ایسی ہستیوں کے دلوں میں بودیں جو ہر لحاظ سے ان ہی جیسی ہیں۔''[1]

یہ وہی حقیقت ہے کہ جسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ''متواتر روایت'' میں جو شہرت یافتہ ہے، ارشاد فرمایا اور نصیحت بھی فرمائی ہے کہ ''قرآن اور اہلِ بیت اطہار علیہم السلام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں، تو کبھی بھی گمراہ نہ ہوں گے، دراصل اس سے مراد (پورا) دِین ہے۔اگر ان دو (قرآن اور اہلِ بیت علیہم السلام) میں سے کسی ایک سے دور ہو گئے تو گمراہی یقینی ہے۔

۲۔آلِ محمد علیہم السلام کون ہیں؟

اب تک کی گفتگو سے، بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اہل بیت علیہم السلام سے مراد، صرف آئمہ معصومین علیہم السلام ہیں نہ کہ نہج البلاغہ کے بعض مفسرین کی رائے کے مطابق حمزہؓ، عباسؓ اور جعفرؓ حضرات کہ جو پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں تھے اور انھوں نے اپنی قربانیاں دینِ اسلام کی حفاظت کے لیے پیش کیں، صحیح ہے کہ اُن حضرات کی خدمات بہت قیمتی ہیں، لیکن اوپر دیے گئے آٹھ (۸) جملے سوائے معصومین علیہم السلام کے کسی اور کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے۔

---

[1] نہج البلاغہ، کلماتِ قصار، حکمت ۱۴۷

چوتھا حصّہ

زَرَعُوا الْفُجُوْرَ وَ سَقَوْهُ الْغُرُوْرَ وَ حَصَدُوا الثُّبُوْرَ لَا يُقَاسُ بِآلِ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ أَحَدٌ وَ لَا يُسَوّٰى بِهِمْ مَنْ جَرَتْ نِعْمَتُهُمْ عَلَيْهِ أَبَدًا هُمْ أَسَاسُ الدِّيْنِ وَ عِمَادُ الْيَقِيْنِ إِلَيْهِمْ يَفِيْءُ الْغَالِيْ وَ بِهِمْ يُلْحَقُ التَّالِيْ وَ لَهُمْ خَصَائِصُ حَقِّ الْوِلَايَةِ وَ فِيْهِمُ الْوَصِيَّةُ وَ الْوِرَاثَةُ الْآنَ إِذْ رَجَعَ الْحَقُّ إِلٰى أَهْلِهِ وَ نُقِلَ إِلٰى مُنْتَقَلِهِ.

''ان لوگوں نے فجور کا بیج بویا ہے اور اسے غرور کے پانی سے سینچا ہے اور نتیجے میں ہلاکت کو کاٹا ہے۔ یاد رکھو کہ آلِ محمدؐ پر اس امت میں سے کسی کو قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ ان لوگوں کو ان کے برابر قرار دیا جا سکتا ہے جن پر ہمیشہ ان کی نعمتوں کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ آلِ محمدؐ دین کی اساس اور یقین کا ستون ہیں۔ ان سے آگے بڑھ جانے والا پلٹ کر انہیں کی طرف آتا ہے اور پیچھے رہ جانے والا بھی انہیں سے آ کر ملتا ہے۔ ان کے پاس حقِ ولایت کی خصوصیات ہیں اور انہیں کے درمیان پیغمبرؐ کی وصیت اور ان کی وراثت ہے۔ اب جب کہ حق اپنے اہل کے پاس واپس آ گیا ہے اور اپنی منزل کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔''

شرح وتفسیر

اہلِ بیت علیہم السلام کا کوئی ہم پلّہ نہیں

اس خطبے کے زمان و مکان (جنگ صفین کے بعد یہ خطبہ تاریخ میں محفوظ ہے) کو مدنظر رکھا جائے تو، اس خطبے کے پہلے تین جملوں (کے ضمیر) سے اندازہ ہوتا ہے کہ موضوعِ گفتگو ''اصحابِ امیر شام'' اور ''گروہِ خوارج'' ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ مراد ''گروہِ منافقین'' ہوں یا پھر، وہ تمام افراد مراد ہیں جو (اپنے مفادات اور جہالت کی بنا پر) حضرتِ امیر المومنین علیہ السلام سے مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے بہر حال ایک ایسی تشبیہ استعمال کی گئی ہے، جو اُس وقت کے حالات اور پورے ماجرے کا واقعی نقشہ پیش کرتی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

زَرَعُوا الْفُجُوْرَ [۱] وَسَقَوْهُ الْغُرُوْرَ [۲] وَحَصَدُوا الثُّبُوْرَ [۳]

''انھوں نے فسق و فجور کا بیج بویا اور آبِ غرور نیز دھوکے بازی کے ذریعے اس کی آبیاری کی، آخر کار (اسلامی معاشرے اور اپنے دل کی سرزمین میں) بدبختی اور ہلاکت کی منحوس فصل کی کٹائی کی، یہ وہی تین (زمین کی تیاری اور بیج کا بونا، فصل کی تیاری اور فصل کی کٹائی) کاشتکاری کے مراحل ہیں، جو آج کل زراعت کے شعبے میں رائج ہیں۔''

ایک بار پھر امامِ عالی مقام آلِ محمدؐ کی صفات کو بیان کرتے ہوئے، واضح اور روشن عبارتوں کے ذریعے اُن کے مقام کی عظمت کو اُجاگر کرتے ہیں، نیز اپنے مخصوص انداز میں خاندانِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چھینے گئے حقوق کی یاد آوری فرماتے ہیں:

''لَا یُقَاسُ بِآلِ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہِ مِنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اَحَدٌ''

''پوری اُمت میں سے کوئی بھی آلِ محمدؐ سے موازنے کے قابل نہیں''۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی دلیل نہایت روشن اور واضح ہے۔''

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیث ثقلین میں کہ جس کا تقریباً تمام علمائے اسلام نے بالاتفاق اپنی احادیث کی کتابوں میں تذکرہ کیا ہے اور آلِ محمدؐ کو قرآن کا ہمدم شمار کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ پوری اُمّت میں سے صرف اہلِ بیتِ رسول علیہم السلام قرآن کے ہم نشین ہیں اور اُن ہستیوں کے سوا کوئی اور اس بات کی قابلیت نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ قرآن کی آیات کی روشنی میں جیسا کہ آیتِ تطہیر ان اہل بیتؑ کے معصوم ہونے کی گواہی دے رہی ہے تو آیتِ مباہلہ ان ہستیوں میں سے بعض (حضرت علی علیہ السلام) کے نفسِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کا اعلان کر رہی ہے، نیز اور بھی آیات اور روایات ایسی ہیں، جن میں اس موضوع کے ثبوت کے دلائل کثرت سے موجود ہیں۔ اگر علم و معرفت کے میدان میں انواع و اقسام کے علوم و دانش کا جائزہ لیا جائے تو جو علم و حکمت کے انمول خزانے اہلِ بیتِ رسول علیہم السلام سے ہم تک پہنچے ہیں، دوسرے اُس کی گرد

---

[۱] ''فجور'' کا مادّہ ''فجر'' ہے، یعنی ''کسی چیز میں بہت بڑا شگاف ڈال دینا''۔ صبح کے طلوع ہونے کو ''فجر'' اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ''صبح کا نور، رات کی سیاہی کے پردے کو چاک کر دیتا ہے'' اسی طرح ناجائز کاموں کو بھی ''فجور'' کہتے ہیں، کیونکہ یہ کام دیانتداری کے پردے کو چاک کر دیتے ہیں۔

[۲] ''غرور'' یعنی بیداری کی حالت میں غفلت کی کیفیت، یہ دھوکے اور مکر و فریب کے معنی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ''غَرور'' یعنی ہر وہ چیز جو انسان کو دھوکا دیتی ہے اور غفلت کا شکار کرتی ہے اور بعض مرتبہ یہ ''شیطان'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، کیونکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ''لوگوں کو جھوٹے وعدے دے کر فریب دینا''۔

[۳] ''ثبور'' کا اصل مادّہ ''ثبر'' ہے، اس کا وزن ''صبر'' ہے یعنی ''قید کرنا'' اور اس کے بعد یہ ''ہلاکت اور فساد'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ جو انسان کو اُس کے مقصد تک پہنچنے نہیں دیتا۔

تک بھی نہیں پہنچ پائے ہیں۔ مثال کے طور پر جو کچھ اسی نہج البلاغہ میں موجود ہے کیا اُس کا عشرِ عشیر کہیں کسی اور کے پاس بھی پایا جاتا ہے؟!! کیا صحیفہ سجادیہؑ کی دُعاؤں کے مجموعے میں سے کوئی ایک دُعا، اُس سے ملتی جلتی کسی اور کے حصّے میں بھی آئی یا کہیں کسی کے پاس پائی گئی ہے؟

جتنی وسعت، گہرائی اور ایک ایک نکتے کی تفصیل، حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے مکتب اور آثار میں احکامِ اسلام (مذہبی لٹریچر) کے حوالے سے موجود ہے، کیا نظامِ اسلام سے متعلق ایسا کوئی جامع، عقل وفہم کا مرقع پیش کر سکا ہے!!؟ مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ کیے جانے والے محیر العقول (عقلوں کو حیرت میں ڈال دینے والے) مناظروں اور ان کے عقائد کی آراء اور نظریات نیز بنیاد کے خام اور ناکارہ ہونے کے دلائل کو خود ان ہی کی کتابوں سے پیش کرنے کے ناقابلِ یقین، تاریخی معرکوں کو سر کرنے والے، حضرات امام علی بن موسیٰ الرضا علیہما السلام کے کارناموں میں سے کسی ایک کارنامے کا کوئی مقابلہ کرنے والا نہیں۔ غفلت و جہالت سے بیدار کرنے والے ایسے حیران کن واقعات یا تو معجزے کی شکل میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں نظر آتے ہیں، یا پھر آپؐ کے پاکیزہ خاندان میں کرامات کی شکل میں نظر آتے ہیں، یہ صلاحیتیں اور اُن کے مظاہروں کا مقصد اور فلسفہ صرف اور صرف یہ ہے کہ دینِ الٰہی کی حقیقت کو اُجاگر کیا جائے اور انسانوں کو گمراہی سے ہدایت کی طرف لایا جائے، دین کا بول بالا ہو اور ہر انسان نجاتِ ابدی پائے۔ اہلِ بیتِ رسول علیہم السلام کے علاوہ پوری اُمتِ مسلمہ میں کوئی ایک فرد بھی ایسا ہے!!؟؟ ''محمدؐ اور آلِ محمد علیہم السلام'' کے بغیر کوئی، کچھ بھی نہیں؛ اسلام ان سے اور یہ اسلام سے پہچانے جاتے ہیں''۔

اس کے بعد ایک جملہ مولائے کائناتؑ نے فرمایا ہے، جو پچھلے جملے کی ''دلیل'' کے طور پر سمجھ میں آتا ہے:

''وَلَا يُسَوّٰى بِهِمْ مَنْ جَرَتْ نِعْمَتُهُمْ عَلَيْهِ اَبَدًا''

''کیا ایسا ممکن ہے کہ جو افراد آلِ محمدؐ کی نعمتوں کے دسترخوان سے مستفید ہوتے رہے (اور ہو رہے ہیں) خود اہل بیت علیہم السلام کے برابر ہو جائیں؟''

یقینی طور پر ایسا ہونا ہرگز ممکن نہیں۔ اس سے بڑھ کر کیا نعمت ہوگی کہ اگر حضرتِ علی ابن ابی طالب علیہما السلام کی قربانیاں نہ ہوتیں تو پھر ہر عام وخاص، دائرۂ اسلام میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا، اس عظیم انسان کی تاریخی زندگی کا لیلۃ المبیت کے واقعے سے لے کر، جنگِ بدر، اُحد، خیبر اور خندق تک ایک ایک لمحہ اِس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے۔ یاد کیجیے وہ لمحہ کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا:

''ضَرْبَةُ عَلِيٍّ يَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْنِ''

نیز اس سے مشابہ مضمون ایک اور جگہ فرمایا:

"لَمُبَارَزَةُ عَلِيٍّ لِعَمْرِو بْنِ عَبْدِوَدٍّ اَفْضَلُ مِنْ اَعْمَالِ اُمَّتِيْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔"[1]

لیلۃ المبیت وہ رات ہے، جس میں مولا علی علیہ السلام نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان بچانے کے لیے، اپنے آپ کو ڈھال بنایا اور جان تک کی بازی لگانے سے دریغ نہ کیا، جنگ خیبر میں کہ جب مختلف لوگوں کو (علم دے کر) بھیجا گیا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا، آخر کار امام علیؑ کو بھیجا گیا اور آپؑ نے درِ خیبر کو اُکھاڑ پھینکا، جنگ اُحد پر ایک نظر ڈالیے، مولائے کائناتؑ نے بے مثال جرأت اور استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے، نہایت حساس حالات میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیا جبکہ اُس وقت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالکل تنہا رہ گئے تھے اور لشکر اسلام تتر بتر ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ، تاریخِ اسلام کا لمحہ لمحہ اس بات کا گواہ ہے کہ نہ جانے کتنے ایسے مقامات آئے ہیں کہ جب اسلام اور مسلمانوں کو رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں اور اُس کے بعد بھی، ایک بھرپور حمایت اور مدد کی ضرورت تھی، کوئی حسّاس موقع ایسا نہ تھا، جہاں امیر المومنین علیہ السلام کے زور بازو اور علم و دانش کی روشنی نے دینِ خدا اور مسلمانوں کی کارفرمائی نہ کی ہو اور یہ حقیقت کسی صاحب دانش سے پوشیدہ نہیں ہے۔ خلفائے ثلاثہ کا دور رہا ہو یا بنی امیہ کا تاریک دور یا پھر بنی عباس کا دورِ سیاہ، اگر کہیں اسلام کی شمع جلتی نظر آتی ہے یا مسلمانوں کو بیگانوں کی تہذیب و ثقافت سے بچاؤ کا انتظام کیا جاتا رہا یا پھر زمانۂ جاہلیت کی سنتوں سے مکمل حفاظت کا بندوبست کسی کے ذریعے کیا جا رہا ہے تو وہ وسیلہ اور وہ نظام نظامِ امامت ہے اور وہ ہستیاں آئمہ معصومین علیہم السلام ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جو کم ازکم کسی محقق، دانشور اور تاریخ دان نیز دین شناس سے پوشیدہ نہیں، اگرچہ اہل بیت علیہم السلام کے قسم خوردہ دشمنوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا ڈالا کہ ہر عام و خاص کو کسی طرح، اہلِ بیت علیہم السلام کی حقیقت سے بے خبر رکھا جائے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مولائے کائنات علیہ السلام مذکورہ بالا جملے میں فرماتے ہیں: اہلِ بیت علیہم السلام کے وجودِ بابرکت کی نعمت کسی خاص زمانے اور دَور سے مخصوص اور محدود نہیں، بلکہ یہ مسلسل اور ابدی ہے، کیونکہ سچ تو یہ ہے کہ آج ہم، بحیثیت مسلمان اسلام کے پاک و پاکیزہ شجر سے جو بھی پھل کھا رہے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ اسلام کی حقّانیت سے قریب تر ہو تے جا رہے ہیں۔ یہ سب اثرات اور نتائج دراصل پیغمبر اسلامؐ اور خاندانِ پیغمبرؐ کے مرہونِ منت ہیں۔ یہ اُن عظیم ہستیوں کی زحمتیں تھیں، جن کی وجہ سے نہ صرف اسلام آئندہ نسلوں تک بھی منتقل ہوتا رہا۔ اس کے بعد امیر المومنینؑ یوں بیان فرماتے ہیں:

"هُمْ اَسَاسُ الدِّيْنِ وَعِمَادُ الْيَقِيْنِ"

[1] دیکھئے احقاق الحق: جلد ۶ ص ۴، جلد ۱۶ ص ۴۰۲، اور کتاب اعیان الشیعۃ: جلد ۱ ص ۲۶۴۔

''اہلِ بیت علیہم السلام دین کی اساس اور بنیاد ہیں اور یقین کے بلند و بالا اور مستحکم ستون ہیں۔''

جی ہاں، یہی وہ خاندان ہے جہاں وحیِ الٰہی نازل ہوئی اور آغوشِ وحی میں ہی اُن ہستیوں کی پرورش ہوئی ہے، اُن عظیم انسانوں کے پاس اگر دین کے معارف ہیں تو وہ سب کے سب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اُن تک پہنچے ہیں، اور چونکہ اصل اسلام ان کامل انسانوں کی گفتار و کردار کی شکل میں محفوظ ہے، لہٰذا ان ہستیوں کی شخصیات عوام الناس کے لیے دین اور یقین کا سر چشمہ ہیں۔

اب جب بات اس مقامِ فکر تک آ پہنچی ہے تو اس کے بعد کے جملوں میں امامِ دین و یقین اس طرح سے نتیجہ اخذ فرماتے ہیں:

''اِلَيْهِمْ يَفِيْءُ الْغَالِيْ، وَبِهِمْ يَلْحَقُ التَّالِيْ''

''غلو کرنے والے (حد سے بڑھ جانے والے) اُن (امامِ برحق کی فکر) کی جانب واپس پلٹ جاتے ہیں اور پیچھے رہ جانے والے، ان سے ملحق ہوجاتے ہیں۔''

اور کیوں نہ ایسا ہو کہ جب اہلِ بیت علیہم السلام دین کے صراطِ مستقیم ہیں [۱] اور (یہی گواہیِ قرآن کے مطابق) اُمّتِ وسط ہیں [۲] کہ جن کے پاس بغیر کسی افراط و تفریط کے دینِ اسلام کے حقیقی احکام، عقائد، اَخلاق اور کامل تعلیمات موجود ہیں، وہ نہ صرف روحِ اسلام شریعت و قرآن کے مزاج سے آشنا ہیں، بلکہ اُسے بیان کرنے اور عملی جامہ پہنانے والے ہیں۔ اگر اسلامی فرقوں کے عقائد کی تاریخ کا ایک جائزہ لیا جائے، تو وہ فرقے جو اہل بیت علیہم السلام سے کسی بھی وجہ سے دور رہے، طرح طرح کے انحرافات، خرافات نیز شکوک و شبہات میں غوطہ زن نظر آتے ہیں، ایک گروہ، اسماء و صفاتِ الٰہی میں جبر، تشبیہ اور الحاد میں مبتلا ہے تو دوسرا گروہ، اسی موضوع کے بارے میں غُلو کی ایسی حد کو پہنچ چکا ہے کہ راہِ عقل و شعور کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''ہم کچھ سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ (نہ تو اجمالی معرفت حاصل کی جا سکتی ہے اور نہ ہی تفصیلی) اسی گروہ کے مدمقابل ایک اور گروہ ہے، جو (نعوذ باللہ) ذاتِ خداوندِ باری تعالیٰ کو اتنا نیچے لاتا ہے کہ گویا خدا ایک جوان لڑکے کی شکل میں ہے جس کے حسین بال آپس میں اُلجھے ہوئے گیسو کی طرح ہیں۔ ان باطل عقائد اور جاہلانہ افکار سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں اور جہاں تک جبر و تفویض کا موضوع ہے تو، ایک گروہ جذبات کی رو میں بہہ کر اس نتیجے تک جا پہنچا کہ انسان تو قسمت کے ہاتھوں بے چارہ اور مکمل طور پر مجبور ہے، تقدیر نے جو کچھ لکھ دیا ہے پس وہی کچھ ہوگا، اُس کو کسی بھی قسم کا کوئی اختیار نہیں دیا گیا، چاہے وہ

---

[۱] تفسیر نور الثقلین: جلد ۱، صفحہ ۲۰، ۲۱

[۲] تفسیر نور الثقلین: جلد ۱، صفحہ ۱۳۴

کفر کا راستہ اختیار کرے یا ایمان کا۔ جبکہ ان سب سے ہٹ کر ایک گروہ اور بھی ہے، جس نے انسان کو مختارِ کل تسلیم کر لیا ہے اور اتنے اختیارات اُسے دے دیے ہیں کہ گویا انسان اور خدا ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں اور تفویض کا عقیدہ قبول کرتے ہوئے، شرک اور ذاتِ خدا میں دوگانگی کو اختیار کر بیٹھے ہیں۔

ان تمام باطل گروہوں کے مقابلے میں صرف ایک مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام ہے، جس نے جبر و تفویض کے الحادی عقیدے کی نفی کرتے ہوئے صحیح اسلامی اور فطری عقیدے ''امر بین الامرین'' (نہ جبر ہے نہ تفویض) کو پیش کیا، مسلمانوں کو خطرناک ترین افراط و تفریط اور کفر آمیز عقائد سے ہوشیار کیا۔ اس مقام پر، کلامِ امام معصومؑ کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، جیسا کہ آپؑ نے فرمایا:

''غلو کرنے والے اہلبیت علیہم السلام کی جانب پلٹ آئیں، پیچھے رہ جانے والے اپنی رفتار کو بڑھائیں تا کہ کاروانِ ہدایت کے ہم رکاب ہو جائیں۔''

یہاں امام علیہ السلام علم و عرفان نے ایک کاروان کو نظروں میں مجسم کیا ہے، جس کے راہنما اور رہبر صاحبِ بصیرت و حکمت ہیں، جبکہ ان کے ساتھ چلنے والے اپنی من مانی کرتے ہوئے مختلف راستوں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ ایک گروہ زیادہ تیزی دکھاتا اور آگے نکل جاتا ہے اور صحرا و بیابان میں راستہ بھٹک جاتا ہے جبکہ دوسرا گروہ ''سُستی کے مارے'' پیچھے رہ جاتا ہے اور جنگل کے درندوں کی خوراک بن جاتا ہے۔ آخر میں، ایک مکمل نتیجہ اخذ کرتے اور فرماتے ہیں:

''وَلَهُمْ خَصَائِصُ حَقِّ الْوِلَايَةِ''

''ولایت اور حکومت کا حق صرف اہلِ بیتِ رسولؐ کے لیے مخصوص ہے۔''

اس جملے میں لفظ ''لَھُم'' کو پہلے بیان کیا گیا ہے۔ عربی قواعد کے مطابق جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو اس سے مراد کسی صفت کا، کچھ خاص افراد سے مخصوص ہونا ہے، نیز دوسروں سے اُس صفت یا خصوصیات کی نفی کرنا اور ہونا سمجھا جاتا ہے یعنی دین ہو یا سیاست، عوام ہوں یا خواص، انسانی معاشروں کی انفرادی اور اجتماعی تعلیم اور تربیت نیز نصیحت و ہدایت ایک خدائی عہدہ اور ذمّے داری ہے جو صرف رسولؐ اور اہلِ بیتِ رسولؐ کا حق ہے اور کیوں نہ حقِ ولایتِ اہلِ بیت علیہم السلام سے مخصوص ہو۔ جبکہ قرآن و سنّت میں یہ ہستیاں دین کی بنیاد اور یقین کے ستون کے طور پر متعارف کرائی گئی ہیں۔

اگر اسلام کو بغیر کسی افراط و تفریط کے کوئی ہے جو بیان کر سکے تو وہ صرف خاندانِ پیغمبرؐ ہے اور اس خاندان کی نعمتوں کا فیض عام، (خدا کی رحمت کی طرح) ہر عام و خاص تک پہنچ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنے اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں (بار بار) وصیت فرمائی ہے اور (حکمِ خدا کے مطابق، دعوتِ ذوالعشیرہ سے لے کر حجۃ الوداع کے دن اعلانِ ولایت تک) اپنی خلافت و جانشینی کو خدا کی جانب سے اہلِ بیت علیہم السلام میں قرار دیے جانے کا اعلان فرمایا ہے:

"وَفِيْهِمُ الْوَصِيَّةُ وَالْوِرَاثَةُ"

''اور انہیں کے درمیان پیغمبرؐ کی وصیت اور ان کی وراثت ہے۔''

اگر رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہلِ بیت علیہم السلام کے بارے میں وصیّت فرمائی ہے اور بندگانِ خدا کی راہنمائی کی حسّاس ذمّے داری ان کے سپرد کی ہے تو اس کی وجہ یہی حقائق ہیں، جو اوپر بیان ہو چکے، نہ کہ حسب و نسب اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رشتے داری۔ ظاہر سی بات ہے کہ یہاں پر وصیت اور وراثت کے موضوع کا براہ راست تعلق صرف مقامِ خلافت و نبوت سے ہے اور جن لوگوں نے اس موقع پر ارث سے علومِ پیغمبرؐ کا ارث مراد لی ہے، بالکل صحیح سمجھا ہے۔ اور مقصد یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اس مقام کے لیے شائستہ اور پوری طرح قابلیت رکھتے ہیں، اس لیے کہ جو کوئی بنی نوع انسان کا پیشوا اور راہنما بننے جا رہا ہے، اُسے وارثِ علومِ پیغمبرؐ ہونا ہی چاہیے اور رسولؐ کا جانشین ہی اُس کا وصی ہوا کرتا ہے، کیونکہ مال و دولت کا وارث ہونا کوئی فخر کا باعث نہیں، اور پھر ذاتی مسائل میں وصیت کوئی غیر معمولی واقعہ اور ذمے داری شمار نہیں کی جاتی اور جن لوگوں نے وصیت اور وراثت (رسولِ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صرف ذاتی مسئلے کے طور پر معنی لیے ہیں، دراصل منافقت اور جہالت کی بنا پر اہل بیت علیہم السلام کی حقیقت اور حق جانشینی کے بارے میں تعصب برتا ہے، نیز مقامِ نبوت اور رسالت کے بارے میں بنیادی تحقیق اور حقائق کو نظر انداز کر کے اندازوں اور قیاس آرائیوں سے متاثر ہو کر، خام تصورات کو سوچنے سمجھنے کا معیار بنایا ہے، ذرا غور کیجیے۔ ان جملوں:

"اَسَاسُ الدِّيْنِ وَ عِمَادُ الْيَقِيْنِ وَ خَصَائِصُ حَقِّ الْوِلَايَةِ"

کے ساتھ جو موضوع، عقلی اور منطقی طور پر مناسبت رکھتا ہے، وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، کی خلافت اور جانشینی کا مسئلہ ہے، نہ کہ ذاتی مسائل یا کوئی اور موضوع! آخر کار اپنے آخری جملے میں اپنے زمانے کے قدر ناشناس لوگوں کو متوجّہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اَلْاٰنَ اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰى اَهْلِهٖ وَ نُقِلَ اِلٰى مُنْتَقَلِهٖ" [1]

''سب اچھی طرح سُن لیں، اس وقت، حق اُس کے اہل تک پلٹ آیا اور اپنے اصلی مقام تک پہنچ چکا ہے۔''

پھر کوتاہی، سُستی، نیز انتشار و اختلاف کا شکار ہونا، کیا اس عظیم نعمت سے اب بھی غفلت برتتے رہو گے اور انجان بنے رہو گے؟ وصیت اور وراثت کے بارے میں، مذکورہ بالا سطروں میں، اب تک جو کچھ زیر بحث آ چکا، اس سے یہ بات

[1] اس جملے میں (قرینے کی وجہ سے) ایک نکتہ محذوف ہے یعنی پورا جملہ یوں ہے'' ''اَلْاٰنَ اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰى اَهْلِهٖ لِمَ لَا تُؤَدُّوْنَ حَقَّهٗ''

یہی جملہ وضاحت کے ساتھ نہج البلاغہ کے مصادر میں اس طرح تحریر ہے: ''اَلْاٰنَ اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰى اَهْلِهٖ مِنْ اَهْلِ بَيْتِ النُّبُوَّةِ يَجْرِيْ مَا يَجْرِيْ مِنَ الْحَوَادِثِ وَ يَقَعُ مَا يَقَعُ مِنَ الْاِخْتِلَافِ'' (مصادرِ نہج البلاغہ: جلد ۱، صفحہ ۳۰۲) البتہ دونوں عبارتوں کا نتیجہ ایک ہے۔

واضح ہوجاتی ہے کہ حق سے مراد اس موقع پر حقِ خلافت اور ولایت ہی ہے۔ اور اگر کوئی اس حق کا اصل مستحق اور اہل ہے تو وہ اہلِ بیت رسول علیہم السلام ہیں، سچ تو یہ ہے کہ اس حق کی مثال ایک لباس جیسی ہے جو صرف اہل بیت علیہم السلام کے قد و قامت کے مطابق اور اُن پر ہی جچتا ہے۔

دو اہم نکات

۱۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں عظمتِ اہلِ بیتؑ

آیاتِ قرآنی اور روایاتِ اسلامی میں جس انداز سے اہل بیتؑ کا تذکرہ کیا گیا ہے، اُس سے اُن کے کردار و گفتار کی بلندی کا پتا چلتا ہے اور ان ہستیوں کی نورانیت نیز روحانیت سے اپنے اور بیگانے سب ہی حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔

آیتِ تطہیر کا واضح اعلان ہے:

"اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا"۔[۱]

اے (پیغمبرؐ کے) اہلبیت خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو (ہر طرح کی) برائی سے دُور رکھے اور جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے ویسا پاک و پاکیزہ رکھے۔

دوسرے الفاظ میں اہل بیت علیہم السلام معصوم ہیں۔

" فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَآئَنَا وَ أَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآئَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِیْنَ"۔[۲]

آیتِ مباہلہ کی روشنی میں امام علیؑ نفسِ رسولؐ اور جانِ پاک رسولؐ کے مقام پر فائز ہیں یعنی گفتار و کردار میں ہر لحاظ سے رسولؐ جیسے ہیں۔ حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا، اور ان کے دونوں فرزند، امام حسن اور امام حسین علیہما السلام رسول اللہؐ سے سب سے زیادہ قریب ہیں، ان ہستیوں کے بارے میں یہ خدا کا اعلانِ عام ہے۔ اس کے علاوہ ایک اعزاز اور، جو غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے یہ ہے کہ خدا کی بارگاہ میں ان ہستیوں کی دعائیں مستجاب (فوراً قبول ہوتی) ہیں۔

آیتِ تبلیغ اس حقیقت سے پردہ اُٹھاتی ہے کہ آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض میں سے سب سے زیادہ اہم

---

[۱] سورۂ احزاب: آیت ۳۳

[۲] سورۂ آل عمران: آیت ۶۱

فریضہ جسے پوری نبوت کی ذمّے داریوں کے برابر قرار دیا گیا ہے، وہ ولایتِ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اعلان کو دنیا والوں کے کانوں تک پہنچانا تھا۔ یہاں تک کہ آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ"

''اور اگر آپ نے (یہ حکم) نہ پہنچایا تو پھر آپ نے اس سلسلے میں اپنی رسالت کا فریضہ انجام نہیں دیا۔ [۱]

اور بھی متعدد آیات اس موضوع سے متعلق موجود ہیں، لیکن اس مقام پر اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں، اس کے علاوہ کثرت کے ساتھ سیکڑوں کتابوں میں، اہل سنّت کی کتابوں کے مصادر و ماخذ کی تفصیلی معلومات کے ساتھ، آیات کی تشریحات موجود ہیں۔ [۲] اسلامی روایات میں، بالخصوص وہ احادیث جو صحاح ستہ (وہ چھے احادیث کی مشہور کتب جو اہل سنّت کی نظر میں سب سے زیادہ معتبر ہیں) میں موجود ہیں، اُن میں اہلِ بیتؑ سے متعلق فضائل اور مناقب اتنی کثرت سے نقل ہوئے ہیں کہ بعض افراد کو شاید یقین دلانا مشکل ہوگا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بعض صاحبانِ علم وفضیلت نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے، ان چھے کتابوں سے فضائل اہل بیتؑ کی جمع آوری کی اور اُس کا خلاصہ کر کے چند جلدوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا انسائیکلو پیڈیا تیار کر دیا۔ [۳]

نیز بعض نے تو اکثر مصادرِ روایاتِ اہلِ سنّت کے ماخذ سے، ان روایات کی جمع آوری کر ڈالی اور دسیوں جلدوں کی صورت میں جمع کیا۔ [۴] لیکن افسوس کہ رسولِ گرامیؐ کی آنکھ بند ہونے کے بعد، حاکمانِ وقت نے کچھ ایسے طور طریقے اپنائے کہ عوام الناس، اہل بیتؑ کے مقام اور عظمت سے زیادہ سے زیادہ ناواقف رہیں۔ جن لوگوں نے اہل بیت اطہار علیہم السلام کو اُن کے حق تک (رحلتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد) پہنچنے نہیں دیا، انہی لوگوں نے اس خاندان کے فضائل ومناقب اُمّت تک پہنچے میں رکاوٹیں ڈالیں۔ حد تو یہ تھی کہ اُموی اور عباسی خلفا کے زمانے میں ''اہل بیتؑ کے فضائل بیان کرنے پر مکمل پابندی عائد کی ہوئی تھی، جو خاندانِ رسولؐ کے مناقب اور گفتار و کردار کا تذکرہ کرتے پایا جاتا، اُس کے لیے سخت سے سخت سزائیں مقرر کی گئی تھیں۔ کبھی طویل قید کی سزا تو کبھی ہاتھ پیر سے معذور کر دیے جانے کی سزا اور سر تن سے جدا کر دینا بھی معمولی بات تھی، اس ستم پر اعتراض اور احتجاج کرنے والے کے ساتھ بھی مجرموں والا سلوک روا رکھا جاتا۔ یہ تو خدا کا ارادہ تھا کہ اہل

---

[۱] سورۂ مائدہ: آیت ۶۷

[۲] تفسیر نمونہ میں ہر آیت سے متعلق وضاحت اور ماخذ ومصادر کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، مزید تشریحات کے لیے، احقاق الحق: جلد ۳، تفسیر پیامِ قرآن جلد ۹ کی طرف رجوع کیجیے۔

[۳] کتاب ''فضائل الخمسۃ من الصحاح الستۃ''، تحریر، دانشمند، محقق مرحوم فیروز آبادی۔

[۴] عبقات الانوار، تحریر مرحوم آیت اللہ العظمیٰ میر حامد حسین ہندی

بیتؑ پیغمبرؐ کے حقائق اور فضائل تاریخ میں سینہ بہ سینہ نیز کتابوں کی شکل میں محفوظ رہ جائیں اور آئندہ آنے والی نسلوں تک، تا روزِ قیامت منتقل ہوتے رہیں، تا کہ تشنگانِ حقیقت وصداقت، اس خاندانِ ہدایت کے در سے سیراب ہوسکیں اور بندگانِ خدا کا رشتہ اپنے ربّ سے برقرار رہے۔

اس موقع پر، ابن ابی الحدید کی بات یاد آ گئی وہ کہتے ہیں کہ قابلِ صد احترام انسان کے بارے میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں، وہ ایسی عظیم ہستی تھی، جن کے فضائل کا اعتراف، اُن کے دشمن کرتے تھے اور کرتے ہیں نیز تمام تر کوششوں کے باوجود، مولائے کائناتؑ کے فضائل کو پوشیدہ نہیں کر پائے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ بنی امیہ کا پورے عالم اسلام پر قبضہ تھا اور تمام تر حیلوں، بہانوں سے جعلی حدیثوں کے گھڑنے، منبروں سے سبّ وشتم کے ذریعے ان کے نور کو خاموش کرنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ ان کی تعریف کرنے والوں کو ڈراتے دھمکاتے اور کسی کو یہ اجازت نہ تھی کہ کوئی ان کی فضیلت میں کوئی ایک حدیث بیان کرے یا کوئی ان کا نام لے۔ اس کے باوجود ان کے مقام ومنزلت کو کم نہ کر سکے۔

حضرت امام عالی مقامؑ کے فضائل دشمن جتنا بھی چھپالے، چھپ نہیں سکتے ہیں، بلکہ ان میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ وہ ایسے سورج ہیں جسے کوئی اپنی ہتھیلی سے چھپانے سے نہیں چھپا سکتا، وہ ایک ایسی روشنائی ہیں کہ اگر ایک آنکھ پر پردہ ڈال کر چھپالیں تو کئی آنکھیں اُن کے نور سے منور ہوسکتی ہیں۔[۱]

اس حقیقت کا ایک اور اعتراف، امام شافعی، اپنی بعض کتب میں مختصر اور مفید انداز میں یوں کرتے ہیں:

''میں تو حیرت زدہ رہ گیا ہوں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک انسان، جس کے انتہا کو پہنچے ہوئے دشمن اُس کے فضائل کو پوری طرح پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں اور اُس کے دوست موت کے خوف سے، اُس کے مناقب بیان کرنے سے عاجز ہیں، لیکن مشرق سے مغرب تک پورا جہاں اُس کے محاسن سے لبریز ہے۔''[۲]

اسی سے ملتا جلتا مضمون، عامر بن عبداللہ بن زبیر نے بھی نقل کیا ہے۔[۳]

۲۔ نامعقول توجیہات!

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ابن ابی الحدید اپنی شرحِ نہج البلاغہ میں جب "اَلْآنَ اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰی اَهْلِهٖ" کے جملے

---

[۱] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید: جلد ۱، صفحہ ۱۷

[۲] علی علیہ السلام فی الکتاب والسنۃ: جلد ۱، صفحہ ۱۰

[۳] الغدیر: جلد ۱۰، صفحہ ۲۷۱

پر پہنچ کر کہتے ہیں: اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ اس سے پہلے حق نا اہل افراد کے اختیار میں تھا۔ لیکن اُس کی توجیہ میں یہ کہیں گے کہ امام علیؑ بے شک خلافت کے لیے سب سے زیادہ لائق، مناسب اور ترجیح رکھتے تھے، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے امیر المومنینؑ کے لیے کوئی نص (قرآن وسنّت سے) وارد ہوئی ہے، بلکہ افضلیت کی بنیاد پر ہم یہ نظریہ رکھتے ہیں، کیونکہ تمام مسلمانوں میں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علیؑ ہی سب سے زیادہ خلافت اور جانشینی کے قابل اور اہل تھے، البتہ اُنھوں نے ایک مصلحت کی وجہ سے اپنے حقِ خلافت کو ترک کر دیا، کیونکہ ان کا اپنا (مولا علیؑ کا) اور دوسرے مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ اُن کے خلافت سنبھالنے سے اسلام اور اس کی نشر واشاعت کے سلسلے میں مشکلات اور شدید تناؤ پیدا ہونے کا خطرہ ہے، وہ اس لیے کہ عرب علی مرتضیٰ علیہ السلام سے اپنے دلوں میں کینہ وحسد رکھتے تھے۔ لہٰذا، یہ بات بالکل معقول ہے کہ جو حق کسی نے ترک کیا تھا، بعد میں وہ حق اُس کی طرف پلٹ آئے تو اس موقع پر یہ کہا جاتا ہے کہ "اَلْآنَ اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰی اَهْلِهٖ" یعنی امر صاحب امر کی طرف پلٹ آیا۔[1]

یقینی طور پر تعصب اور جانبدارانہ سوچ، اتنے واضح اور روشن کلام کو سمجھنے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے، کیونکہ اگر امام علی علیہ السلام چاہتے تو یوں بھی فرما سکتے تھے، اس سے پہلے، حق اُس کے اہل کے سپرد نہیں کیا گیا تھا، اور اب اُس کے اہل تک پہنچا ہے اور اپنے شائستہ مقام پر پلٹ آیا ہے اور اس سے زیادہ روشن عبارت، کیا ممکن تھی جو کہتے؟

ایک رخ بات کا یہ تھا اور دوسرا رُخ یہ کہ عرب امام علی علیہ السلام سے حسد کرتے اور عداوت رکھتے تھے، سراسر بے بنیاد بات ہے۔ ہاں، یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ایک محدود طبقہ ایسا تھا جو دراصل شرک اور کفر کی سرپرستی کرنے والوں سے وابستہ لوگ تھے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ قریش و یہود کے چند سربراہ اور منافقین ایسے لوگ تھے کہ جنھوں نے جنگ بدر وخیبر اور حنین میں آپؑ کی ذوالفقار کے ضربات کا مزہ چکھا تھا، جس کی وجہ سے ان کے دلوں میں امیر المومنینؑ کی نسبت بغض وعداوت پائی جاتی تھی، جبکہ اکثر مسلمان آپؑ کی نسبت عشق ومحبت سے سرشار تھے۔ اس بات کو اسلام کے معتبر منابع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک معروف حدیث میں یوں دیکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت امیر المومنینؑ کے شانوں پر اپنا دست مبارک رکھتے ہوئے فرمایا:

"لَا يُبْغِضُكَ اِلَّا مُنَافِقٌ"

---

[1] اس جملے میں (قرینے کی وجہ سے) ایک نکتہ محذوف ہے یعنی پورا جملہ یوں ہے "اَلْآنَ اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰی اَهْلِهٖ لِمَ لَا تُؤَدُّوْنَ حَقَّهٗ"۔
یہی جملہ وضاحت کے ساتھ نہج البلاغہ کے مصادر میں اس طرح تحریر ہے: "اَلْآنَ اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰی اَهْلِهٖ مِنْ اَهْلِ بَيْتِ النُّبُوَّةِ يَجْرِیْ مَا يَجْرِیْ مِنَ الْحَوَادِثِ وَ يَقَعُ مَا يَقَعُ مِنَ الْاِخْتِلَافِ" (مصادر نہج البلاغہ: جلد ۱، صفحہ ۳۰۲) البتہ دونوں عبارتوں کا نتیجہ ایک ہے۔

''صرف اور صرف منافق ہے جو تم سے دشمنی رکھتا ہے۔''[۱]

اہل سنّت کے معروف ترین مصادر میں سے ایک صحیح ترمذی ہے، اس کتاب میں ابوسعید خدریؓ نقل کرتے ہیں:

"اِنَّا کُنَّا لَنَعْرِفُ الْمُنَافِقِیْنَ بِبُغْضِھِمْ عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ"

''ہم منافقوں کو اُن کی علی ابن ابی طالب علیہما السلام سے دشمنی کے ذریعے سے شناخت کیا کرتے تھے۔''[۲]

کیا ابن ابی الحدید اس پر تیار ہو جائیں گے کہ اُس زمانے کے بیشتر مسلمانوں کو منافقوں میں شمار کریں۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت علیؑ کی خلافت کے لیے بیعت کرنے والوں نے جس والہانہ انداز میں استقبال کیا تھا، ایسا استقبال اس سے پہلے کسی بھی خلیفہ کے بارے میں دیکھنے میں نہیں آیا، جبکہ والہانہ استقبال کرنے والوں میں اکثریت اُن ہی صحابۂ رسولؐ یا ان کے فرزندوں کی تھی جو خلفائے ثلاثہ کے زمانے میں تھے۔ یہ درحقیقت اصل حقائق کو تسلیم نہ کرنے کے لیے ایک نامعقول عذر ہے جو نہ تو قابلِ قبول ہے اور نہ ہی مطابقِ حقیقت ہے۔

اور یہ بات کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہما السلام کی خلافت اور ولایت کے بارے میں کسی قسم کی نص (قرآن وسنّت کی روشنی میں) وارد نہیں ہوئی ہے، یہ بالکل خلافِ حقیقت ہے، جسے ہم سابقہ ابحاث میں (دلائل کے ساتھ) تفصیل سے ثابت کر چکے ہیں۔[۳]

---

[۱] شواہد التنزیل، جلد ۱، صفحہ ۳۲۹۔

[۲] صحیح ترمذی: جلد ۱۳، صفحہ ۱۶۸، طباعت، الصاوی مصر، جلد ۵، صفحہ ۶۳۵، طباعت، داراحیاء التراث العربی

[۳] پیامِ قرآن جلد ۹ کی طرف رجوع کریں۔

تیسرا خطبہ

وَمِنْ خُطْبَةٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

وَهِيَ الْمَعْرُوفَةُ بِالشِّقْشِقِيَّةِ وَتَشْمُلُ عَلَى الشَّكْوَىٰ مِنْ أَمْرِ الْخِلَافَةِ ثُمَّ تَرْجِيحِ صَبْرِهِ عَنْهَا ثُمَّ مُبَايَعَةِ النَّاسِ لَهُ"

جسے شقشقیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اور یہ خطبہ خلافت کے متعلق کچھ شکایات پھر اس پر صبر کو ترجیح دینے اور لوگوں کو بیعت کی طرف متوجہ کرنے پر مشتمل ہے۔

پہلا حصہ

أَمَا وَاللهِ لَقَدْ تَقَمَّصَهَا فُلَانٌ وَإِنَّهُ لَيَعْلَمُ أَنَّ مَحَلِّي مِنْهَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحَى يَنْحَدِرُ عَنِّي السَّيْلُ وَلَا يَرْقَى إِلَيَّ الطَّيْرُ فَسَدَلْتُ دُونَهَا ثَوْباً وَطَوَيْتُ عَنْهَا كَشْحاً وَطَفِقْتُ أَرْتَئِي بَيْنَ أَنْ أَصُولَ بِيَدٍ جَذَّاءَ أَوْ أَصْبِرَ عَلَى طَخْيَةٍ عَمْيَاءَ يَهْرَمُ فِيهَا الْكَبِيرُ وَيَشِيبُ فِيهَا الصَّغِيرُ وَيَكْدَحُ فِيهَا مُؤْمِنٌ حَتَّى يَلْقَى رَبَّهُ فَرَأَيْتُ أَنَّ الصَّبْرَ عَلَى هَاتَا أَحْجَى فَصَبَرْتُ وَفِي الْعَيْنِ قَذًى وَفِي الْحَلْقِ شَجًا أَرَى تُرَاثِي نَهْباً.

''آگاہ ہو جاؤ! خدا کی قسم فلاں شخص نے قمیص خلافت کو کھینچ تان کر پہن لیا ہے، حالانکہ اسے معلوم ہے کہ خلافت کی چکی کے لیے میری حیثیت مرکزی کیل کی ہے۔علم کا سیلاب میری ذات سے گزر کر نیچے جاتا ہے اور میری فکر کی بلندی تک کسی کی بھی فکر اور سوچ پرواز نہیں کر سکتی۔ پھر بھی میں نے خلافت کے آگے پردہ ڈال دیا اور اس سے پہلو تہی کر لی اور یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کٹے ہوئے ہاتھوں سے حملہ کر دوں یا اسی بھیانک اندھیرے پر صبر کر لوں، جس میں سن رسیدہ بالکل ضعیف ہو جائے اور بچہ بوڑھا ہو جائے اور مومن محنت کرتے کرتے خدا کی بارگاہ تک پہنچ جائے۔تو میں نے دیکھا کہ ان حالات میں صبر ہی قرینِ عقل ہے تو میں نے اس عالم میں صبر کر لیا کہ آنکھوں میں مصائب کی کھٹک تھی اور گلے میں رنج وغم کے پھندے

تھے۔ میں اپنی میراث کو لٹتے دیکھ رہا تھا۔''

خطبہ، ایک نگاہ میں

یہ خطبہ نہج البلاغہ کے اہم ترین خطبوں میں شمار ہوتا ہے، اس کا موضوع رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلافت ہے اور اُس سے متعلق اہم مسائل ہیں۔ مختصر ہونے کے باوجود اس میں، خلفائے ثلاثہ اور حضرت علیؑ کے زمانے سے متعلق تاریخ اسلام کا مکمل جائزہ پیش کیا گیا ہے، صاحبانِ علم و دانش کے لیے انتہائی، دلچسپ اور گہرے مطالب، تجزیے اور تبصرے ہیں، جو مطالعے کے لائق ہیں۔ اس خطبے کی تشریح اور تفسیر کا آغاز کرنے سے پہلے، چند نکات کا جاننا مفید ہوگا۔

خطبے کا نام:

خطبے کے نام کا انتخاب، اسی خطبے کے آخری جملے سے کیا گیا ہے، ابھی خطبہ مکمل نہیں ہوا تھا، گفتگو جاری تھی، لیکن کسی نے امامؑ سے سوال کیا، امامؑ نے اپنی بات کو ترک کر دیا اور سائل کے سوال کا جواب دیا، جب جواب دے چکے تو ابنِ عباسؓ نے خلیفہ اور وقت کے امامؑ سے خطبے کو دوبارہ وہیں سے شروع کرنے کی درخواست کی، جہاں سے اُس کا سلسلہ ٹوٹا تھا، امامِ مظلومؑ نے (انسانی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے) فرمایا: ''تِلْكَ شِقْشِقَةٌ هَدَرَتْ ثُمَّ قَرَّتْ''، اردو زبان میں اس بات کو یوں کہتے ہیں ''دل میں ایک آگ کا شعلہ بھڑکا اور پھر ٹھنڈا ہو گیا''۔ سائل کے سوال نے جہاں امامؑ کی توجہ ہٹائی، وہاں کیفیت اور احساس میں بھی تبدیلی آ گئی۔

خطبے کا زمانہ:

اس خطبے کے زمانے کے بارے میں نہج البلاغہ کی شرح کرنے والوں کے درمیان بحث و گفتگو ہے، بعض محققین جیسے محقق خوئی کی رائے ہے کہ خطبے کے موضوعات، اس کی اسناد اور اس کے راویوں کو پرکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ، یہ خطبہ امیر المومنینؑ کی اس جہان فانی کی زندگی کے آخری دنوں کی بات ہے، یعنی جب جنگ جمل، صفین، اور نہروان جو گروہِ ناکثین، قاسطین اور مارقین سے لڑی گئیں [1] کا ماجرا انجام پا چکا تھا۔ انصاف تو یہ ہے کہ خطبے کے مضامین بھی اس رائے کی تائید کرتے ہیں۔

خطبے کا مقام:

نہج البلاغہ کی شرح لکھنے والوں نے، اس خطبے کی جگہ کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے، لیکن بعض افراد کا خیال

---

[1] منہاج البراعۃ فی شرح نہج البلاغہ، جلد ۳، ص ۳۲

ہے کہ امام المتقینؑ کا یہ خطبہ مسجد کوفہ کی یادگار ہے، جبکہ ابن عباسؓ کی رائے یہ ہے کہ یہ خطبہ ''رحبہ'' [۱] میں تاریخ کا حصّہ بنا ہے، یہ بات ہے اُس وقت کی کہ جب مسئلہ خلافت پر بات چھڑی اور امام علی علیہ السلام کے قلبِ مبارک پر ایک بجلی سی کوند گئی اور آپؑ نے اپنے مخصوص انداز اور ظلم وزیادتی کے خلاف عدالت پسندانہ مزاج کے مطابق آسمانِ شرک والحاد کو ڈھا دینے والی شعلہ بیانی کا معجزانہ لب ولہجہ اختیار فرمایا اور پھر آپؑ کی لسانِ مبارک سے کلام جاودانہ سرچشمۂ دانائی اور بینائی وبصیرت بن کے جاری ہوا جو ''خطبۂ شقشقیہ'' کے نام سے نہج البلاغہ کی زینت ہے۔

خطبے کی سند:

خطبے کی سند کے بارے میں بھی اختلافات موجود ہیں، بعض محققین کی رائے کے مطابق یہ خطبہ متواتر خطبوں (جو کثرت سے بیان کیے گئے ہوں) میں شمار کیا جاتا ہے، جبکہ بعض نے اس بات سے ہی انکار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ خطبہ امام علی علیہ السلام کا ہے ہی نہیں اور امام علیہ السلام نے کبھی خلافت کے بارے میں کوئی شکایت نہیں کی، بلکہ یہ تو سیّد رضیؒ نے خود سے ہی ایک خطبہ بنا لیا ہے۔ [۲] مشہور ومعروف شارحِ نہج البلاغہ علّامہ ابن میثم بحرانی کہتے ہیں، یہ دونوں دعوے غلط اور افراط وتفریط کا نتیجہ ہیں؛ اس خطبے کی سند حدِ تواتر تک نہیں پہنچتی۔ اور دوسری طرف یہ دعویٰ کہ یہ خطبہ سیّد رضیؒ کا بنایا ہوا ہے، یہ بھی حقیقت پر مبنی نہیں ہے، حق یہ ہے کہ یہ امام علیؑ ہی کا خطبہ ہے۔

اس خطبے کی سند میں جو شکوک وشبہات گھڑے جا رہے ہیں، وہ اس وجہ سے نہیں کہ اس میں کوئی ضعف اور فتور ہے یا نہج البلاغہ کے تمام دوسرے خطبات سے مختلف اور متضاد ہے، بلکہ اس کے برعکس اس خطبے کی ایسی متعدد اسناد موجود ہیں کہ ایسی اسناد نہج البلاغہ کے بعض دوسرے خطبوں کی نہیں ملتیں۔ اس خطبے کے سلسلے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے والا واحد سبب یہ ہے کہ یہ خطبہ اور اس کے مندرجات بعض لوگوں کی ذہنیت سے مطابقت نہیں رکھتے، ایسے لوگوں نے بجائے اس کے کہ اپنی ذہنیت کی اصلاح کرتے، خطبے کی سند ہی کو مشکوک بنانے کی سازش کر لی۔ بہرحال نہج البلاغہ کے علاوہ اس خطبے کی اسناد میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

۱۔ ابنِ جوزی اپنی کتاب ''تذکرۃ الخواص'' میں لکھتے ہیں: یہ خطبہ امام علیہ السلام نے ایک شخص کے سوال کے جواب میں اُس وقت دیا، جب آپ منبر پر رونق افروز تھے اور اس نے اٹھ کر یہ سوال کیا:

---

[۱] رحبہ، کے معنی وسیع جگہ کے ہیں، بعض کے نزدیک کوفے کے محلات میں سے کسی ایک کا نام ہے، بعض کے نزدیک کوفہ سے آٹھ فرسخ دور ایک آبادی کا نام ہے۔ (مجمع البحرین، مراصد الاطلاع)

[۲] شرح نہج البلاغہ ابن میثم، جلد ۱، ص ۲۵۱

"مَا الَّذِیْ اَبْطَاَ بِكَ اِلَی الْاٰنَ" [1]

''کس سبب سے خلافت آپؑ کو ابھی تک نہیں ملی تھی؟''

یہ بات خود اس بات کی نشان دہی کر رہی ہے کہ ابن جوزی کے پاس یہ خطبہ کسی اور وسیلے سے پہنچا تھا دوسرے یہ کہ اس شخص کا سوال نہج البلاغہ میں نہیں ہے۔ اس طرح یہ حتمی ہے کہ ابن جوزی نے یہ خطبہ کسی دوسرے ذریعے سے حاصل کیا ہے۔

۲۔ مشہور شارح نہج البلاغہ ''ابن میثم بحرانی'' کہتے ہیں، یہ خطبہ مجھے دو کتابوں میں ملا ہے جن کی تاریخ تالیف سیّد رضیؒ کی پیدائش سے پہلے کی ہے، ان میں سے ایک کتاب ''الانصاف'' ہے، جسے ''کعبی'' کے شاگرد ''ابوجعفر ابن قبہ'' نے جو معتزلہ فرقے کی مشہور شخصیت تھے، تحریر کیا ہے اور ان کی وفات سیّد رضیؒ کی ولادت سے پہلے ہوئی تھی۔

۳۔ دوسری کتاب جس میں مجھے یہ خطبہ ملا ہے، وہ ''ابوالحسن علی بن محمد بن فرات'' ہے، جو ''المقتدر باللہ'' کے وزیر تھے، یہ خطبہ ان کی تحریر میں بھی ہے، ان کا انتقال بھی سیّد رضیؒ سے تقریباً ساٹھ ۶۰ سال پہلے ہوا تھا۔ اس کے بعد مزید کہتے ہیں، میرا غالب خیال یہ ہے کہ یہ نسخہ ابنِ فرات کی پیدائش سے بہت پہلے کا ہے۔ [2]

۴۔ ابن ابی الحدید مزید کہتے ہیں میرے استاد ''واسطی'' سن ۶۰۳ھ میں اپنے استاد ''ابنِ خشاب'' سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے میرے اس سوال کے جواب میں کہ آیا یہ خطبہ واقعی جناب امیر المومنین علیہ السلام کا ہے؟ فرمایا:

''میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ مجھے اس خطبے کے کلامِ علی علیہ السلام ہونے کا اتنا ہی یقین ہے جتنا اس بات کا کہ تم مصدق ابنِ شبیب واسطی ہو۔''

میں نے بات جاری رکھی اور کہا: بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ یہ سیّد رضیؒ کا اپنا کلام ہے۔ انہوں نے جواب میں کہا، ''سیّد رضیؒ یا غیرِ سیّد رضیؒ کہاں اور یہ بیان و اسلوب کہاں! ہم نے سیّد رضیؒ کی تحریریں دیکھی ہیں اور ان کی نثر نگاری کے فن، طریقے اور روِش کو اچھی طرح پہچانتے ہیں، جس کی اس خطبے سے کوئی شباہت نہیں۔'' پھر مزید کہا ''میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے یہ خطبہ ایسی کتابوں میں دیکھا ہے، جو سیّد رضیؒ کے پیدا ہونے سے دو سو سال پہلے لکھی گئی تھیں۔ میں نے یہ خطبہ ایسے علما اور اہلِ ادب کی تحریروں میں دیکھا ہے جنہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں اور بتا سکتا ہوں کہ کون سی تحریر کس عالم کی لکھی ہوئی ہے اور یہ سب سیّد رضیؒ کے والد کے پیدا ہونے سے بھی پہلے کی ہیں۔

---

[1] تذکرۃ الخواص، ۱۲۴

[2] شرح ابن میثم بحرانی، ج ۱، ص ۲۵۲

اس کے بعد ابن ابی الحدید کہتے ہیں:

''میں نے خود یہ خطبہ استاد ''ابوالقاسم بلخی'' کی تحریر میں دیکھا ہے جو معتزلہ کے بزرگ علما میں سے تھے اور ''المقتدر باللہ'' کے ہم عصر تھے، جو سیّد رضیؒ کی ولادت سے بہت پہلے انتقال کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے شاگرد ''ابنِ قبہ'' (جو متکلمینِ امامیہ میں سے تھے) کی کتاب ''الانصاف'' میں بھی دیکھا ہے یہ بھی سیّد رضیؒ کے پیدا ہونے سے پہلے کے ہیں۔''[1]

مرحوم علامہ امینی نے اپنی مشہور کتاب ''الغدیر''[2] میں اس خطبے کو نقل کرنے کے بعد ۲۸ کتابوں سے اس کا حوالہ دیا ہے۔

خطبے کے مضامین

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ یہ خطبہ اُن تمام مسئلوں اور مشکلات پر مبنی ہے جو بعدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسئلہ خلافت پر پیش آئیں۔ نیز اُن مشکلات کا بھی بیان ہے جو پچھلے خلفا کے دور میں پیش آئیں۔ بہت مختصر لیکن وسیع معنی اور مفہوم رکھنے والے جملوں کے ذریعے آپ نے ان کی تشریح کی ہے اور صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ بعدِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ ہی اس مقام کے لیے خلافت کے سب سے زیادہ حقدار تھے اور شدید رنج کا اظہار کرتے ہیں کہ کس طرح خلافت اپنے اصل محور سے ہٹ گئی۔ خطبے کے اختتام پر لوگوں کی خود سے بیعت کی تفصیل بیان فرماتے ہیں اور اُن مقاصد کا ذکر فرماتے ہیں جن کی بنا پر آپ نے خلافت قبول کی۔

شرح وتفسیر

مسئلۂ خلافت کے بارے میں اہم تجزیہ

پہلے بھی اس کے بارے میں بتایا جا چکا ہے، یہ خطبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد معاشرے میں اُٹھنے والے ہولناک طوفانوں کو بیان کر رہا ہے، ان طوفانوں اور فتنہ وفساد کو برپا کرنے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ کسی طرح خلافت اور امامت کو اس کے اصل مرکز اور محور سے ہٹا دیا جائے۔ جب اُمّت مسلمہ نے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کے مسئلے میں نافرمانی کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واضح اعلان کے باوجود نیز حکم خدا (نصِ صریح) کے بیان ہو جانے کے بعد بھی غفلت

---

[1] شرح ابن ابی الحدید، ج ۱، ص ۲۰۵

[2] الغدیر، ج ۷، ص ۸۲

برتی، یا کسی بھی قسم کی مصلحت کا شکار ہوئے، جس کے نتیجے میں عالمِ اسلام ایک بڑے انتشار کا شکار ہوا اور طرح طرح کی مشکلات پیدا ہونا شروع ہوگئیں۔ خلافت کے پہلے مرحلے کے بارے میں بیان کرتے ہوئے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَمَا وَاللّٰہِ لَقَدْ تَقَمَّصَھَا [1] فُلَانٌ وَاِنَّہُ لَیَعْلَمُ اَنَّ مَحَلِّیْ مِنْھَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحَا" [2]

''قسم خدا کی! جب اس نے لباسِ خلافت کو پہنا تو اس وقت وہ (پہننے والا) یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا کہ مسئلۂ خلافت میں میری حیثیت آٹے کی چکّی میں اُس کی کیل جیسی ہے۔'' (کہ جس کے بغیر وہ چکّی چل نہیں سکتی)

یہ یقینی بات ہے کہ "تَقَمَّصَھَا" میں موجود ضمیر "ھَا" سے مراد ''خلافت'' ہے۔ اور "قَمِیْصِ"، شاید اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ فلاں شخص نے خلافت کے مسئلے کو اپنے جسم کو چھپانے اور اپنے تن کی زینت بنانے کے لیے قمیص کے طور پر استعمال کر ڈالا جبکہ اس عظیم چکّی کو ایک طاقتور محور اور مرکز کی ضرورت تھی، جو چکّی کے نظام کو تیز رفتاری کے ساتھ حرکت کرنے میں مددگار ثابت ہو، نیز اُسے اپنی سمت سے منحرف نہ ہونے دے اور یہ عالمِ اسلام میں پیدا ہونے والے نشیب و فراز میں پورے نظام کی حفاظت کر سکے اور اس کی حرکت، اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کے لیے ہو۔

جی ہاں! خلافت قمیص نہیں، بلکہ معاشرے کو چلانے والا محور اور مرکز ہے، لہٰذا خلافت کو ایک محور کی ضرورت ہے نہ یہ کہ کوئی اُس خلافت کو اپنا لباس بنالے اور ذاتی رائے کے مطابق استعمال کرے۔ اور پھر اس معنیٰ (خلافت کے معنی) کے لیے ایک واضح دلیل پیش کرتے ہیں جو ناقابلِ انکار ہے۔ حضرت امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"یَنْحَدِرُ [3] عَنِّی السَّیْلُ، وَلَا یَرْقیٰ اِلَیَّ الطَّیْرُ"

''میرے وجود سے مسلسل (علم و حکمت کے) چشمے اور سیلاب جاری و ساری رہتے ہیں، عالم وہم و خیال میں بلند ترین پرواز کرنے والا پرندہ، میری روح کی بلندی نیز گفتار و کردار کی گہرائی تک نہیں پہنچ پاتا۔''

"یَنْحَدِرُ" سے مراد اوپر سے گرنا اور بہہ کر نیچے آنا ہے "وَلَا یَرْقیٰ" سے مراد ہے ''اوپر نہیں جاتا'' یہاں پر دو مختلف پہلوؤں کو استعمال کیا گیا ہے، جو ایک دوسرے کے مقابلے میں دو متضاد نکات ہیں، جس دلچسپ نکتے کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے، وہ یہ ہے کہ امامؑ کے وجود کو ایک عظیم پہاڑ سے تشبیہ دی گئی ہے، جس میں بلند ٹیلے اور چٹانیں ہیں۔ ان ٹیلوں کی خاصیت

---

[1] تقمّص، قمیص کے مادّے سے ہے، یعنی کُرتا اور تقمّص کے معنی ہیں، ''پیراہن زیب تن کر لینا''۔

[2] الرحی، یعنی چکّی کا پتھر، جس کے گھومنے سے چکّی کام کرتی ہے اور آٹا پیستی ہے، یہ مادّہ ''ناقص وادی'' اور ''ناقص یائی'' دونوں طرح استعمال ہوا ہے۔

[3] ینحدر، انحدار کے مادّے سے ہے۔ اس کے معنی ہیں: بہت کثرت اور زیادہ مقدار میں اونچائی سے نیچے کی جانب بہاؤ کرنا۔

یہ ہے کہ وہ اپنے اندر آسمان سے نازل ہونے والی اشیاء اور برکات کو محفوظ کرتے ہیں اور مسلسل رُوئے زمین کی جانب اُن خداداد نعمتوں کو بھیجتے رہتے ہیں، جس کے نتیجے میں درخت، سبزہ نیز پھول اور بُوٹے اُگتے ہیں۔ ان عظیم پہاڑوں اور ان کی بلندی تک کوئی پرندہ نہیں پہنچ پاتا، لیکن وہ زمین اور اہل زمین کو مادّی اور روحانی فوائد سے نوازتے رہتے ہیں۔

یہ تشبیہ دراصل اشارہ ہے قرآنی تشبیہ کی جانب جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے کہ زمین کو متوازن رکھنے اور اس کو آباد کرنے میں پہاڑ نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

"وَ اَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ وَ اَنْهٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ" [۱]

''اللہ نے زمین پر مستحکم اور ساکن (ثابت) پہاڑوں (کے سلسلے) کو قرار دیا تا کہ زمین کی لرزش کو دور کیا جا سکے اور اُن کے ذریعے سے نہریں بنائیں اور زمین میں راستوں کو ایجاد کیا تا کہ تم لوگوں کی ہدایت کی جا سکے۔''

جی ہاں، اگر زمین پر عظیم پہاڑوں کا جال نہ بچھایا گیا ہوتا تو زمین کا اندرونی دباؤ، چاند اور سورج کی کشش اور زمین کی سطح کا مدوجزر نیز طوفانی دباؤ کے اثرات مل کر، انسانی زندگی کے چین اور سکون کو بری طرح درہم برہم کر دیتے اور پھر آسمان سے جو پانی برستا تو ایک عظیم سیلاب کی شکل میں سمندروں میں جا کر گرتا، نہ تو کسی نہر کا وجود ہوتا اور نہ ہی کوئی چشمہ ہوتا۔

رُوئے زمین پر ہر اُمت کے لیے ایک توانا، بیدار اور آگاہ امامِ معصومؑ کا وجود ہر قسم کی برکات نیز اطمینانِ قلبی اور ایمان کی مضبوطی کا باعث ہے، ان الفاظ اور خصوصیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؑ کے عظیم استاد حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے سوا کوئی انسان حضرت امیر المومنینؑ کے افکار کی گہرائی، معرفت کی عظمت نیز ان کی دائمی اور آفاقی شخصیت کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے اصحاب و پیروکاروں نے اپنے وجود اور ظرفیت کے مطابق اس علم کے بحرِ بیکراں سے اُن کی علمی گہرائی کا مطالعہ اور استفادہ کیا ہے۔ [۲]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ چکّی کے بڑے بڑے پاٹ چلانے کے لیے بھی، نہر کے پانی کا استعمال کیا جاتا رہا ہے اور پھر، یہ نہریں عظیم پہاڑوں کے دامن سے بہہ کر نیچے آتی ہیں، اس کے علاوہ یہ کہ چکّی کے بڑے بڑے پتھروں کو پہاڑوں سے ہی تراش کر حاصل کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ عین ممکن ہے یہ سارے معنی ہی مراد لیے جا سکیں، یعنی حضرت امام علی علیہ السلام کا مقصد یہ ہے کہ میں نظامِ خلافت و امامت کا محور بھی ہوں اور اُس کی چکّی کا پتھر بھی ہوں۔ نیز جس طاقت سے وہ پتھر حرکت

---

[۱] سورہ نحل: آیت ۱۱

[۲] حضرت علیؑ کے اس آفاقی کلام کے حقائق اور آپ کی تمام امت مسلمہ پر فوقیت کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے اسی کتاب کے مقدمہ کے مندرجات کی طرف رجوع کریں۔

میں آتا ہے وہ طاقت بھی میں ہوں۔

یہ کوئی اور چیز نہیں سوائے علم و دانش کے، جس سے وجودِ مبارکِ مولائے کائناتؑ سرشار تھا۔ اسی طرح جیسا کہ پہلے بھی اس بات کی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے کہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ پہاڑوں کے دامن میں آسمانی برکات اور فیوض جیسے برف وغیرہ جمع ہوتے رہتے ہیں اور تدریجی طور پر پیاسی زمینوں تک یہ برکات پہنچتی رہتی ہیں، اس تشبیہ سے مراد یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت علیؑ سرچشمۂ وحی کے نہایت قریب تھے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود سے فیض یاب ہوتے اور دوسروں تک اُسے پہنچاتے رہتے تھے۔

بعض شارحین نہج البلاغہ کی تعبیر کے مطابق مذکورہ جملے میں لفظ ''سیل'' سے مراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ مشہور حدیث ہے:

''اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُھَا''[1]

''میں علم کا شہر ہوں اور علی اُس کا دروازہ ہے۔''

جس سے حضرت علیؑ کے ''علمِ بیکراں'' کا اندازہ ہوتا ہے۔ نیز قرآن کی یہ آیتِ مبارکہ:

''قُلْ اَرَاَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَاؤُکُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْکُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ''[2]

''اے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لوگوں سے ذرا دریافت تو کرو، اگر وہ تمام پانی جو تم لوگوں کے اختیار میں ہے، زمین اُسے جذب کر لے تو پھر کون ہے جو تم لوگوں کے لیے پانی کا انتظام کرے گا''۔

امام علی بن موسی الرضا علیہما السلام، اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ''مَآءٍ مَّعِیْنٍ''[3] سے مراد علمِ امام علیہ السلام ہے۔ کچھ چھوٹے چھوٹے سوالات ہیں کہ جو اس موقع پر بعض افراد کے اذہان میں پیدا ہوتے ہیں:

پہلا سوال: حضرت علی علیہ السلام اپنی تعریف اپنی زبان سے کیوں فرما رہے ہیں، جبکہ

''تَزْکِیَۃُ الْمَرْءِ لِنَفْسِہٖ قَبِیْحٌ''

''یہ ناپسندیدہ بات ہے کہ کوئی اپنی تعریف خود کرے۔''

جواب: یہ بات بھی واضح رہے کہ خود ستائش اور کسی کو اپنا تعارف کروانا، دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ جب عوام

---

[1] اس مشہور حدیث کی اسناد کو جاننے کے لیے، کتب اہل سنّت کو دیکھیے، احقاق الحق، جلد ۵، صفحہ ۴۶۷ تا ۵۰۱۔

[2] سورۂ ملک: آیت ۳۰

[3] تفسیر نور الثقلین: جلد ۵، صفحہ ۳۸۶، یہ تفسیر، ظاہری تفسیر یعنی آبِ جاری کے مفہوم کے ساتھ کسی قسم کا ٹکراؤ نہیں رکھتی، نیز بعض دوسری تفاسیر بھی صحیح ہیں جن میں ''ماءِ معین'' سے مراد ''امامِ معصومؑ کا اصل وجود'' لیا گیا ہے، کیونکہ یہ آیت مفہوم کے لحاظ سے تینوں معانی سے مناسبت رکھتی ہے۔

الناس کسی شخصیت سے واقف نہ ہوں تو ظاہری بات ہے کہ اُس انسان کی بہترین صلاحیتوں سے بھرپور طریقے سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے، ایسے موقعوں پر انسان کو تعارف کرانے کی ضرورت پیش آتی ہے، اب یہ تعارف کرانا اصل مقصد ہے، چاہے ایک انسان اپنا تعارف خود کرائے جیسے ڈاکٹر اپنے نسخے اور کلینک کے بورڈ پر اپنی اسناد کا مکمل تذکرہ کرتا ہے تاکہ مشکلات کے حل کے لیے لوگوں کی رہنمائی ہو سکے نہ کہ خودنمائی کا پہلو سامنا آ سکے۔

دوسرا سوال: ''یہ جو جملہ ہے

''یَنْحَدِرُ عَنِّی السَّیْلُ، وَلَا یَرْقیٰ اِلَیَّ الطَّیْرُ''

''میرے وجود سے مسلسل (علم وحکمت کے) چشمے اور سیلاب جاری وساری رہتے ہیں، عالم وہم وخیال میں بلند ترین پرواز کرنے والا پرندہ، میری روح کی بلندی نیز گفتار وکردار کی گہرائی تک نہیں پہنچ پاتا۔'' بس ایک زبانی دعویٰ ہے، بھلا اس کو ثابت بھی کیا جا سکتا ہے!!!؟''

جواب: جی ہاں! اس کو ثابت کرنا پہلے والے سوال سے بھی زیادہ آسان اور روشن تر ہے۔ بات یہ ہے کہ جو کوئی بھی تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمین سے تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتا ہے، وہ یقیناً حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی بے مثال شخصیت سے بالخصوص ان کے علم ودانش کے بارے میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کی گئی احادیث سے کم وبیش آگاہی رکھتا ہے۔ آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کی روشنی میں حضرت علیؑ کے وسیع علم کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمان دانشمندوں کی ایک جماعت نے واضح الفاظ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ تمام اسلامی علوم کی بنیاد رکھنے والے حضرت علی بن ابی طالب علیہما السلام ہیں اور آپؑ ہی ان علوم کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ [1]

اس کے علاوہ اگر ماسبق کے زمانے کے حالات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ جب کبھی ایسی مشکل آ پڑتی جو کسی سے حل نہیں ہو پاتی تو، مولائے کائناتؑ کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا اور اُن سے درخواست کی جاتی۔ مولائے متقیانؑ پورے عالم اسلام اور پوری انسانیت کے ہمدم بھی تھے اور ہمدرد بھی، حضرت علی علیہ السلام کی چشمِ بصیرت اس بات کی صلاحیت رکھتی تھی کہ ماضی، حال اور مستقبل کو بہ یک وقت دیکھ سکے۔

نہج البلاغہ کے خطبے، مراسلات (خطوط) اور کلماتِ قصار (مختصر جملوں) کا مطالعہ اس حقیقت کو جاننے کے لیے کافی ہیں۔ مسلمان ہو یا غیر مسلم، ہر انصاف پسند انسان ایک مرتبہ نہج البلاغہ کو پوری توجہ کے ساتھ پڑھ لے تو امیر المومنین علیہ السلام کی

---

[1] ابن ابی الحدید، اپنی ''شرح نہج البلاغہ'' میں اس موضوع کے ضمن میں تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اسلامی علوم میں سے ہر ایک کو باری باری ذکر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ تاریخی لحاظ سے کس طرح، کون سا علم، حضرت علی علیہ السلام کے ''علمِ بیکراں'' سے جاری وساری ہوا۔ (شرحِ ابن ابی الحدید جلد ۱، صفحہ ۱۷ تا ۲۰)

عظمتِ علمی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جائے گا کہ اس جملے "یَنْحَدِرُ عَنِّی السَّیْلُ وَلَا یَرْقیٰ اِلَیَّ الطَّیْرُ" علم و دانش کا سیلابِ عظیم میرے کوہسار وجود سے نیچے آتا ہے اور بلند پرواز پرندے میری بلندیوں تک پر نہیں مار سکتے، کا مفہوم اس پر بخوبی صدق آتا ہے۔

تیسرا سوال: رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلافت کے بارے میں جو کچھ ہوا، امام علیؑ اس کی شکایت کیسے کر سکتے ہیں۔ کیا یہ مقامِ صبر و رضا اور مقامِ تسلیم و بُردباری کے مزاج کے خلاف نہیں؟''

جواب: یہ بھی زیادہ پیچیدہ نہیں، دیکھیے، صبر اور تسلیم و رضا ایک بات ہے جبکہ حقائق کو تاریخ میں محفوظ رکھنا اور آئندہ نسلوں تک منتقل کرنا ایک اہم فریضہ ہے اور یہ بات تسلیم و رضا کے مزاج سے نہیں ٹکراتی، بلکہ بعض مرتبہ تو انسانی زندگی اور اصلاحِ احوال کے لحاظ سے سب سے زیادہ حسّاس اور اہم ذمّے داری بن جاتی ہے (جیسے خلافت اور امامت کا مسئلہ کہ جو پورے عالمِ اسلام کا نیز مسلمانوں کے مستقبل کے سنورنے یا بگڑنے کا اہم ترین مسئلہ تھا)۔ درحقیقت لوگوں کی اصلاح، اسلامی معاشرے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے ضروری تھا کہ امام علیہ السلام ان حقائق کو بیان فرما دیں تا کہ انہیں بھلایا نہ جا سکے۔

پھر امامِ عالی مقامؑ فرماتے ہیں:

"فَسَدَلْتُ[1] دُوْنَهَا ثَوْبًا، وَطَوَیْتُ عَنْهَا كَشْحًا"[2]

''(جب میں نے دیکھا کہ اُس نے آگے بڑھنے میں جلدی کی اور خلافت کو اپنے گھیرے میں لے لیا) تو میں نے اُس سے چشم پوشی کرتے ہوئے (ظاہری اقتدار) خلافت سے کنارہ کش ہو گیا۔''

مذکورہ بیان میں بخوبی اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ جب امامِ مظلومؑ نے کچھ لوگوں کو خلافت کے سلسلے میں آنحضرتؐ کی وصیّت کے برعکس اقدام کرتے ہوئے پایا اور احتجاج کے نتیجے میں، مسلمانوں کے درمیان فتنہ و فساد برپا ہونے کے حالات پیدا ہوتے ہوئے محسوس کیے، تو پوری متانت اور بزرگواری کے ساتھ خلافت ظاہری اور اقتدار کی رسہ کشی سے درگزر کیا اور ہر قسم کے ٹکراؤ سے گریز کیا، لیکن زندگی کی آخری سانس تک امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہما السلام کی روح بے چین رہی کہ عالم اسلام میں پیدا ہونے والے اس عظیم انحراف کی اصلاح کیسے کی جائے۔

---

[1] لفظ، سدلت، سَدْل کے مادّے سے بنا ہے اور اس کا وزن ''عدل'' ہے، اصل میں اس کے معنی ہیں ''کسی چیز کا اوپر سے نیچے کی طرف نازل ہونا اس طرح سے کہ جس چیز پر وہ نازل ہوا ہے، اُس کو پوری طرح ڈھانپ لے، اس بنا پر لفظ، سدلت، کے معنی ''اس کو ترک کر دیا اور اُس پر کوئی چیز ڈال دی'' بنتے ہیں۔

[2] ''کشح'' لفظ ''فتح'' کا ہم وزن ہے اور اس کے معنی ہیں ''پہلو'' عربی میں ''طوی عنہ کشحہ'' اس سے اردو میں بے اعتنائی اور کسی چیز سے درگزر کرنا مراد لیا جاتا ہے، جو دراصل ''کنایہ'' کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے امام مزید فرماتے ہیں:

"وَطَفِقْتُ اَرْتَئِیْ بَیْنَ اَنْ اَصُوْلَ بِیَدٍ جَذَّاءَ[۱] اَوْ اَصْبِرَ عَلٰی طَخْیَةٍ[۲] عَمْیَاءَ"

''میں مسلسل اسی غور وفکر میں غوطہ زن تھا کہ کٹے ہوئے بازوؤں سے (باوفا ساتھیوں کے بغیر) حملہ کروں یا پھر اس تاریک ماحول میں خاموشی اختیار کرلوں اور صبر سے کام لوں۔''

امیر المومنین علیہ السلام اس جملے کے ذریعے ایک تاریخی حقیقت کی جانب توجّہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میں اُمّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں خدا اور رسولؐ کی جانب سے عائد کیے گئے فریضے کو لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں بُھلا پایا تھا لیکن کرتا تو کیا کرتا؟ میں دوراہے پر کھڑا تھا، پہلا راستہ یہ تھا کہ قیام کرتا اور مخالفوں کے ساتھ لڑتا جبکہ ایک طرف میرے ساتھ دینے والے زیادہ نہ تھے، تو دوسری طرف مسلمانوں میں ایک بڑا شگاف پڑنے کا خطرہ تھا اور منافقین اور اسلام کے دشمن ایسے موقع کی تلاش میں تھے اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ اُس جہالت کے تاریک دور میں صبر کرلوں۔''

"طَخْیَةٍ عَمْیَاءَ" سے کیا مراد ہے؟ اسے سمجھنے سے پہلے "طَخْیَةٍ" کے معنی کو جان لیں؛ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اندھیرا ہونے کے باوجود معمولی سا سایہ کوئی حرکت سی، سمجھ میں آرہی ہوتی ہے، یہاں پر مراد یہ ہے کہ اتنی زیادہ تاریکی تھی کہ جب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔

امام المتقینؑ اور زمانے کے امامؑ اُمّتِ مسلمہ پر گزرنے والے حالات کے اثرات اور اُس تاریخی المیے کی صورتِ حال کو ان الفاظ میں عیاں کرتے ہیں:

"یَهْرَمُ فِیْهَا الْکَبِیْرُ، وَیَشِیْبُ فِیْهَا الصَّغِیْرُ، وَیَکْدَحُ[۳] فِیْهَا مُؤْمِنٌ حَتّٰی یَلْقٰی رَبَّهُ"

''ایسا فتنہ کہ جس نے بوڑھوں کو خستہ حال کر دیا تھا، بچّوں کو بڑھاپے تک پہنچا دیا تھا، نیز ایمان والوں (یعنی جو ہر قسم کے حالات میں خدا کا شکر کرتے اور شاداب رہتے ہیں) کو زندگی کی آخری سانس تک رنجیدہ خاطر کر دیا تھا۔'' (اور آج تک اہلِ ایمان غم زدہ ہیں)۔

اس عبارت سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ایک ایسا گہرا رنج وغم تھا، جس نے پورے معاشرے اور معاشرے کے ہر فرد کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، حال یہ تھا کہ اس تکلیف دہ صورتِ حال میں بچّے، بوڑھے نظر آنے لگے

---

[۱] جذاء، یعنی شکستہ اور کٹ کر جدا ہونا۔

[۲] طخیۃ، یعنی تاریکی، ظلمت اور کبھی ہلکے بادل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور ''طخیاء'' یعنی تاریک رات۔

[۳] یکدح، کا مادّہ ''کدح'' ہے جس کے معنی ہیں، محنت اور مشقت کے ساتھ جدوجہد اور کوشش کرنا۔

تھے اور عمر رسیدہ لوگ تو مفلوج ہو کر رہ گئے تھے، لیکن مومنین کا درد سب سے زیادہ تھا، کیونکہ وہ ان حالات کے نشیب و فراز نیز بنیادی وجوہات سے واقف تھے، لہٰذا ان کا غم، زندگی اور موت کا غم بن چکا تھا کہ جس میں نہ سانس آتی ہے اور نہ جان نکلتی ہے اور پھر کچھ ہی مدت گزرنے کے بعد یہ درد اور کرب بنی اُمیہ کی حکومت کی شکل میں ایک مصیبتِ عظمیٰ بن کر نازل ہوا، نہ صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زحمتیں برباد ہو گئیں، بلکہ صدرِ اسلام کے مومنین (جن کے خلوص کی گواہی قرآنی آیات ہیں) کی قربانیاں بھی بھلا دی گئیں۔ بالآخر اُس خطرناک دور اہے پر پہنچ کر، زمانہ شناس امامؑ نے فرض شناسی کا معیار قائم کرتے ہوئے اس ناقابلِ بیان دور کی ان الفاظ میں غمازی فرمائی ہے:

فَرَاَیْتُ اَنَّ الصَّبْرَ عَلٰی هَاتَا [۱] اَحْجٰی [۲]

''(ہر لحاظ سے بہت غور و فکر کے بعد) اس مصیبت کے مقابلے میں آپؑ نے بردباری اور صبر و شکیبائی کو عقل و خرد سے زیادہ قریب جانا۔''

اب ذرا خدا کے ولی حضرت علیؑ کے بیان کو پڑھیے:

فَصَبَرْتُ وَفِی الْعَیْنِ قَذًی [۳] وَفِی الْحَلْقِ شَجًا [۴]

''(یہی وجہ تھی کہ) میں نے صبر سے کام لیا، جبکہ میری حالت زار ایسی تھی جیسے آنکھوں میں خس و خاشاک ہوں اور حلق میں ہڈی پھنسی ہو کہ جسے نہ نگلا جا سکتا ہو اور نہ ہی اُگلا جا سکتا ہو۔''

یہ منہ بولتی عبارت بتا رہی ہے کہ اُمّت مسلمہ کا مظلوم امامؑ، جس کے بارے میں جہاں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کو جھٹلایا گیا ہے، وہاں اُسے خلافتِ ظاہری کے فرائض کو انجام دینے سے روکا گیا ہے تو، تیسری جانب وہ امت کی گمراہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، ایسی صورتِ حال میں تاریخ کا مظلوم ترین انسان احتجاج بھی کرتا ہے تو اُس کے منہ سے نکلنے والی بات پر نادان دوست اور منافقوں کا گروہ بات کا بتنگڑ بناتے ہیں، ایسی عجیب و غریب کیفیت ہے، جسے بہت ہی موزوں الفاظ

---

[۱] لفظ ھا تا میں ھا علامت تنبیہہ ہے (عربی گرامر کی اصطلاح ہے) اور ''تا'' ''اسمِ اشارہ برائے تانیث'' ہے کہ جس کا اشارہ لفظ ''ظخیۃ'' ''تاریکی اور ظلمت'' کی طرف ہے جو گزشتہ جملوں میں ذکر ہو چکا ہے بعض افراد کی نظر میں ''مشار الیہ'' ایک ایسی حالت ہے کہ جو درج ذیل عبارت سے سمجھ میں آتی ہے اور اُس کے معنی کچھ یوں بنتے ہیں (فرایت ان الصبر علی ھذہ الحالۃ احجی) یعنی ''ایسے حالات میں، صبر کرنے کو میں نے عقل کے زیادہ قریب پایا''۔

[۲] احجی، کا اصل مادّہ حجا ہے یعنی عقل لہٰذا، احجی، یعنی زیادہ عقل مندی کے معنیٰ میں آتا ہے۔

[۳] قذی، یعنی آلودگی اور خس و خاشاک۔

[۴] شجی، یعنی ''غم واندوہ''، شدت اور رنج نیز حلق میں پھنس جانے والی ہڈی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

میں ''امام الکلام'' حضرت علی علیہ السلام نے بیان کر دیا ہے:

''اَرٰی تُرَاثِیْ نَهْبًا''

''رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میراث کو تاراج کیا جا رہا تھا اور میں حیرت زدہ تھا کہ آنکھوں کو یقین نہیں آتا تھا اور میرا حلق اتنا خشک تھا کہ آواز نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔''

تاریخی نکات

۱۔ امام علی علیہ السلام نے صبر کو کیوں ترجیح دی؟

تاریخ گواہ ہے کہ منافقین اور اسلام کے دشمن، لحہ بہ لحہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کا انتظار کر رہے تھے، اُن میں سے ایک گروہ کا خیال یہ تھا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد مسلمانوں کی وحدت ٹوٹ جائے گی۔ ایسے حالات پیدا ہوں گے کہ اسلامی انقلاب کے خلاف بغاوت ممکن ہو سکے گی، اور پھر اسلام کے نوخیز پودے کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکیں گے، اب ایسے حالات میں اگر حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام اپنا حق لینے کے لیے یا دوسرے الفاظ میں عالم اسلام کو پیغمبر اسلامؐ کے زمانے کے اصل اسلام کی جانب پلٹا دینے کے لیے قیام کرتے اور اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ پہلے سے اس بات کا منصوبہ تیار کر لیا گیا تھا کہ حضرت علی علیہ السلام کو خلافت کے سلسلے میں منظر عام سے ہٹا دیا جائے، تو پھر یقیناً اس اختلاف کے نتیجے میں ٹکراؤ وجود میں آتا اور پورے اسلامی معاشرے کی عام فضا آلودہ ہوتی اور پھر بحرانی حالات میں منافقوں اور دشمنوں کو اپنی شیطانی نیتوں کو عملی جامہ پہنانے کا سنہرا موقع ہاتھ آ جاتا، اس بات کا بہترین ثبوت، رسولِ اکرمؐ کی رحلت (شہادت) کے فوراً بعد ''اہلِ ردّہ'' کے نام سے مختلف گروہوں کا اسلامی حکومت کے مقابلے میں قیام کرنا اور مسلمانوں کی وحدت کی وجہ سے ان گروہوں کا سرکوب ہو جانا ہے۔ جیسا کہ تاریخ اسلام کی معروف کتابوں میں آیا ہے:

''لَمَّا تُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهِ) اِرْتَدَّتِ الْعَرَبُ وَ اشْرَأَبَّتِ الْیَهُوْدِیَّةُ وَ النَّصْرَانِیَّةُ وَ نَجَمَ النِّفَاقُ وَ صَارَ الْمُسْلِمُوْنَ کَالْغَنَمِ الْمَطِیْرَةِ فِی اللَّیْلَةِ الشَّاتِیَةِ''[1]

''جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی، عرب دین سے مرتد ہو گئے (اور جاہلیت کے رسم و رواج کی جانب پلٹنے لگے)، یہود و نصاریٰ نے سر اُٹھانا شروع کر دیا اور منافق نمایاں ہو گئے، بلکہ علی الاعلان میدان میں کود پڑے، جبکہ

[1] سیرۂ ابن ہشام، جلد ۴، صفحہ ۳۱۶

مسلمانوں کی ایسی حالت تھی جیسے مویشیوں کا گلّہ جو بغیر چرواہے کے ہے، سردیوں کی تاریک رات ہے، آسمان سے پانی برس رہا ہے اور بیابان وجنگل میں یہ راستہ بھٹک چکے ہیں۔''

یہ پورے قصّے کا ایک رخ ہے جبکہ دوسرا رخ یہ ہے کہ یار و یاور نہ ہونے کے باوجود امام علی علیہ السلام قیام کرتے تو کامیابی کے امکانات کم تھے اور اگر قیام کرتے بھی تو بہت سے نادان لوگ اس قیام کو فریضۂ الٰہی کے بجائے ذاتی مفادات کی جنگ سمجھتے۔

خلافت کا اپنے اصل محور اور مرکز سے ہٹ جانا، اسلام کے لیے ایک ایسا دھچکا تھا جس کی وجہ سے پہنچنے والے نقصانات کو شمار کرنا ہی بڑا مشکل کام ہے اور روز بروز بڑھتی ہوئی مشکلات ہی تھیں۔ اور یہی وہ چیز تھی کہ مولا علی علیہ السلام نے فرمایا: ''خار اور خاشاک سے آنکھیں زخمی ہیں اور حلق میں ایسی ہڈی اٹکی ہوئی ہے کہ جو نہ تو نگلی جاسکتی ہے اور نہ اُگلی جاسکتی ہے''۔

اب تک کی بحث سے ہم یہ بنیادی اصول سیکھتے ہیں کہ جب کبھی آپ اپنے حق کے لیے قیام کریں، احتجاج برپا کریں اور آپ کا یہ آواز بلند کرنا دین کی بنیادوں کو ہلانے کا باعث بننے جارہا ہو تو وہاں آپ اپنے حق کو ترک کر کے ''اصل دین'' کی حفاظت کا بیڑا اُٹھالیں اور ''اصول دین'' کو اپنی زندگی کا ہم وغم بنالیں، نیز کسی بھی صورت میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

اس سے ملتی جلتی بات خطبہ ۲۶، نہج البلاغہ میں بھی موجود ہے، فرماتے ہیں:

''فَنَظَرْتُ فَاِذَا لَیْسَ لِیْ مُعِیْنٌ اِلَّا اَھْلَ بَیْتِیْ... وَاَغْضَیْتُ عَلَی الْقَذٰی وَشَرِبْتُ عَلَی الشَّجٰی''

''میں نے غور کیا تو دیکھا کہ اس حق (خلافت وولایت) کو حاصل کرنے کے لیے اگر کوئی میرا ساتھ دینے والا ہے تو وہ صرف میرا اپنا خاندان ہے۔ میں نے انہیں موت کے منہ میں دینے سے بخل کیا۔ آنکھوں میں خس وخاشاک تھا، مگر میں نے چشم پوشی کی، حلق میں گویا ہڈی تھی، مگر میں نے غم وغصے کے گھونٹ پی لیے اور تلخ حالات پر صبر کیا۔''

۲۔ خلافت کو ''میراث'' کا نام کیوں دیا گیا؟

مذکورہ بالا عبارات میں ہم نے پڑھا کہ امام علیؑ فرمارہے ہیں:

''میں دیکھتا رہا اور میری نظروں کے سامنے میری میراث کو غارت کر دیا گیا۔''

یہاں **سوال** یہ پیدا ہوتا ہے کہ خلافت کو ''میراث'' کیوں کہا جارہا ہے؟

جواب یہ ہے کہ دراصل خلافت ایک خدائی اور معنوی (روحانی) میراث ہے، جو پیغمبر اسلامؐ سے اُن کے معصوم

جانشینوں تک پہنچتی ہے اور اس سے کوئی ذاتی، مادّی نیز ظاہری حکومت کی گدّی مراد نہیں۔ اس مضمون کی حامل قرآن کی آیات بھی موجود ہیں جیسا کہ حضرت زکریاؑ نے خدا سے ایک فرزند کی درخواست کی، جو اُن کا وارث اور خاندانِ حضرت یعقوبؑ کا وارث بن سکے اور نبوت کا وارث جو خلقِ خدا کی پیشوائی کا حق ادا کر سکے:

"فَهَبْ لِي مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ" [۱]

''اے خدا! اپنے پاس سے مجھے ایک ولی عہد اور جانشین عطا فرما جو میرا اور خاندانِ حضرت یعقوبؑ کا وارث بن سکے۔''

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ میراث پوری اُمّت سے تعلق رکھتی ہے، لیکن اسے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین اور (معصوم) امامؑ کے سپرد کیا گیا ہے۔ آسمانی کتب کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں:

"ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا"

''اور پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے جن کو منتخب کیا تھا، انھیں (آسمانی) کتاب ورثے میں عطا فرمائی۔'' [۲]

اور اسی انداز میں، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معروف حدیث میں بیان ہوا ہے:

"اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ"

''صاحبانِ علم و دانش، انبیاءؑ کے وارث ہیں۔'' [۳]

اس حقیقت کا ایک زندہ ثبوت ظاہری حیاتِ حضرت علی علیہ السلام کی منہ بولتی تاریخ ہے۔ آپؑ نے گفتار و کردار دونوں لحاظ سے ثابت کر دکھایا کہ نہ تو مال و دولت میں کوئی دلچسپی ہے اور نہ مقام، عہدہ اور خلافت، یعنی ایسی خلافت جس کا خدا کی شریعت سے کوئی تعلق نہ ہو اور صرف دنیاوی اقتدار ہو تو اُس کی اہمیت امام علیؑ کی نظر میں ایک پرانی اور پھٹی ہوئی نعلین یا بکری کی چھینک سے باہر آنے والے مادّے سے بھی کم تھی، تو پھر کیسے ممکن تھا کہ خلافت ہاتھ سے جانے کی وجہ سے آپ بطور شکایت یہ فرمائیں کہ ''آنکھیں گویا خس و خاشاک سے پُر تھیں اور حلق میں ہڈی اٹک گئی تھی۔''

بعض افراد کا خیال ہے کہ ''لٹی ہوئی میراث'' سے مراد ''فدک'' ہے کہ جسے رسولِ خداؐ نے اپنی اکلوتی بیٹی حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کو عطا فرمایا تھا اور کیونکہ زوجہ کا مال شوہر کے مال کا حکم بھی رکھتا ہے لہٰذا حضرت علیؑ نے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔

---

[۱] سورۂ مریم: آیات ۵، ۶

[۲] سورۂ فاطر: آیت ۳۲

[۳] اصول کافی: جلد ۱، ص ۳۲، ۳۴

[1] لیکن یہ خیال بہت ضعیف ہے، کیونکہ یہ پورا خطبہ مسئلہ خلافت کے گرد گھوم رہا ہے اور یہ جملہ بھی اُسی موضوع کی جانب ایک اہم اشارہ ہے۔

۳۔ حضرت امام علیؑ اور گوشہ نشینی

حضرت علی علیہ السلام کو گھر میں گوشہ نشینی اختیار کرنے پر مجبور کیے جانے کا کتنا بڑا نقصان عالم اسلام کو پہنچا ہے۔ صرف علمی لحاظ سے کتنا نقصان ہوا، اس کا اندازہ اس وقت کیا جا سکتا ہے جب ہم نہج البلاغہ کے خطبات، آپ کے اپنے عاملوں کو لکھے ہوئے فرامین اور کلمات قصار کا مطالعہ کرتے ہیں جو حضرتؑ نے اپنے مختصر دورِ خلافت میں دیے جبکہ یہ مختصر سا عرصہ بھی حوادث، مسلسل جنگوں اور دردناک واقعات سے بھرا ہوا تھا۔ غور کیجیے کہ اگر ان ۲۵ برسوں میں بھی جو امامؑ نے گوشہ نشینی میں گزارے، امام علیہ السلام کو امت کی رشد و ہدایت کا موقع ملتا اور علم و دانش کے متلاشی اس علم کے خزینے سے استفادہ کر سکتے تو کتنے عظیم علمی خزینے نہ صرف مسلمانوں بلکہ عالم انسانیت کے لیے یادگار رہ جاتے۔ لیکن کیا کیا جا سکتا ہے کہ اس فیضِ عظیم کو مسلمانوں اور انسانیت سے چھین لیا گیا اور اتنا بڑا نقصان جو کبھی پورا نہیں کیا جا سکتا، وہ تاریخ میں باقی رہ گیا۔

۴۔ امام المتقینؑ نے خلافت کے مسئلے کو کیوں اٹھایا؟

بعض لوگوں کا نظریہ تھا کہ بہتر یہ ہے کہ حضرت علیؑ خلافت کے مسئلے کو کبھی نہیں چھیڑتے، کیونکہ وہ مسئلہ ماضی سے متعلق تھا۔ لہٰذا اس کو بُھلا دینا چاہیے تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کے درمیان اختلافات مزید بڑھ جائیں؟ آج بھی بعض گروہ یہ سوچ رکھتے ہیں اور جیسے ہی حضرت علیؑ کی خلافتِ بلافصل کی بات آتی ہے تو کہتے ہیں کہ خاموشی اختیار کیجیے تا کہ مسلمانوں کی وحدت کو نقصان نہ پہنچے۔

آج ہمیں ایسے موضوعات کو بُھلا دینا چاہیے، ہمارا دشمن بہت طاقتور ہے اور ماضی کے مسائل کو زیر بحث لانے سے مشترک دشمن کے ساتھ مقابلہ کمزور پڑ جائے گا اور ہمارا دشمن مزید شیر ہو گا۔ اصولی بات یہ ہے کہ ایسے موضوعات پر بحث و گفتگو کا فائدہ ہی کیا ہے؟ اور پھر ہر مذہب کے ماننے والے اپنے طے شدہ راستوں پر گامزن ہیں۔ بہت بعید ہے کہ ایسی بحث و گفتگو کسی نئی وحدت کا باعث بنے۔ اس سوال کے جواب میں ضروری ہے کہ دو نکات کو مدنظر رکھا جائے:

الف: موجودہ حقائق کو نظر انداز کر دینے سے حقیقت تبدیل نہیں ہوتی اور نہ ہی اُس کو بُھلایا جا سکتا ہے۔ یہ ایک

---

[1] منہاج البراعۃ (شرحِ نہج البلاغہ) جلد ۳، ص ۴۵

روشن حقیقت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کی جانشینی کی تاکید کی تھی۔ نیز خلافت کے لیے حضرت علی علیہ السلام سے زیادہ کوئی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ اب کون سے ایسے حالات پیش آئے اور کیونکر یہ تبدیلی رونما ہوئی، یہ بالکل ایک الگ بات ہے۔

اُدھر حضرت علی علیہ السلام جو ہر موقع پر حق کے طرفدار ہیں اور ہر اس چیز سے مقابلہ کرتے ہیں جو حقیقت سے تعلق نہیں رکھتی۔ آپؑ حق بجانب ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلافت سے مربوط حقائق کو واضح کریں تاکہ صدیوں اور ہزاروں سال بعد کے محققین انصاف سے کام لیں۔ اگر کوئی حقائق سے کام لے تو وہ یقیناً صراطِ مستقیم پر گامزن ہو سکے گا۔

بہر حال کسی کو حقیقت بیان کرنے سے روکا نہیں جا سکتا اور اگر فرض کر لیا جائے کہ روکنا ہمارے لیے ممکن بھی ہو تو ہمیں ہرگز اس بات کا حق نہیں، کیونکہ یہ ایک بہت بڑے نقصان کا باعث بنے گا اور پھر ہمارے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے اور جو کچھ ہونا چاہیے، اُن دونوں میں اکثر مطابقت نہیں پائی جاتی اور کبھی تو ان دونوں میں بہت زیادہ فاصلہ ہوتا ہے۔

عام طور سے جو کچھ ہوا کرتا ہے، ہمیشہ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ وہی کچھ ہے جو ہونا چاہیے، بلکہ اسلام تو ہم کو یہ اصولِ گفتار و کردار دے رہا ہے کہ انسان کو ہمیشہ اُس چیز کے لیے سرگرمِ عمل رہنا چاہیے جو کہ ہر مسئلے میں واقعاً ہونا چاہیے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد خلافت اور امامت کا موضوع، دینی مباحثوں کا ایک نہایت اہم اور بنیادی موضوع رہا ہے۔ اب چاہے اُسے اصولِ دین کا حصّہ سمجھا جائے، جیسا کہ مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام کی پیروی کرنے والے اس بات کے قائل ہیں یا اس موضوع کو فروعِ دین کا حصّہ سمجھ لیا جائے، جو کچھ بھی سمجھیے، لیکن یہ مسئلۂ خلافت ایک تاریخ ساز موضوع ہے۔ یہ کوئی ذاتی مسئلہ نہیں اور نہ ہی عمومی تاریخ کا ایک معمولی واقعہ ہے، جس کا تعلق ماضی سے ہے، جیسا کہ بعض حقیقت سے ناآگاہ لوگ ایسا سوچتے اور سمجھتے ہیں، بلکہ نسل در نسل اصول اور فروع سے مربوط مسائل پر اثر رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے دورِ خلافت میں بار بار اس موضوع کو بیان کیا۔

ب: مسلمانوں کی وحدت اور اُن کی صفوں کو درہم برہم کرنے والی جو چیز ہے، وہ تعصب آمیز مسائل کو ہوا دینا، فتنہ انگیزی اور خلافِ حقیقت چیزوں کی بے جا حمایت نیز جارحانہ روّیہ اختیار کرنا ہے، لیکن اگر دو مخالف نظریوں اور مسالک کے افراد علمی اور منطقی انداز میں اصول اور آدابِ گفتگو کا خیال رکھتے ہوئے تبادلۂ خیال کریں تو ایسی گفتگو اور بحث و مباحثہ نہ صرف یہ کہ وحدتِ مسلمین کے لیے نقصان دہ نہیں ہے، بلکہ بہت سے موقعوں پر ایسی گفتگو باہمی غلط فہمیوں کو دور کرتی اور قلبی کدورت کے صاف ہونے کا باعث بنتی ہے۔

یہ کوئی خیالی اور ذہن کی گڑھی ہوئی بات نہیں ہے، کیونکہ ہم نے تجربہ کر کے اس بات کو آزمایا ہے۔ ایران کے ایک صوبے میں ہفتۂ وحدت کی مناسبت سے ایک کانفرنس میں شیعہ اور سُنّی صاحبانِ علم و دانش کا ایک اجتماع ہوا۔ ان علماء کے

درمیان علمی لحاظ سے، شیعہ وسنّی کے اہم اختلافی موضوعات پر گفت وشنید ہوئی، جس کا نتیجہ قابلِ قدر اور قابلِ ستائش تھا۔

اس لیے کہ زیادہ تر موضوعات میں نتیجہ یہ نکلا کہ شیعہ اور سنّی نظریات بہت حد تک ایک دوسرے کے نزدیک ہیں اور اختلافات بہت کم ہیں۔ سب کو یقین ہو گیا کہ اگر اس انداز میں ایسی بحث اور گفتگو جاری رہے تو مسلمانوں کے یہ دو اہم ستون شایانِ شان حد تک اپنے اختلافات کو جڑوں سے اُکھاڑ پھینکیں گے؛ ''وحدتِ مسلمین'' کو چار چاند لگیں گے نیز اُن کی صفوں میں مزید نظم وضبط میں اضافہ ہوگا۔[1] یہاں تک کہ آسمانی ادیان کے پیروکاروں کے درمیان بھی موجود اختلافات کو اسی اسلوب اور انداز کو بروئے کار لاتے ہوئے مکمل طور پر دور کیا جا سکتا ہے یا کم ضرور کیا جا سکتا ہے اور جو لوگ اس طرح کی بحث اور بات چیت کے مخالف ہیں، درحقیقت نادانی میں اختلافات کو ہوا دیتے ہیں اور فاصلے مزید بڑھ جاتے ہیں۔

دوسرا حصہ

حَتّٰی مَضَی الْاَوَّلُ لِسَبِیْلِهٖ فَاَدْلٰی بِهَا اِلٰی فُلَانٍ بَعْدَهٗ ثُمَّ تَمَثَّلَ بِقَوْلِ الْاَعْشٰی:

شَتَّانَ مَا یَوْمِی عَلٰی کُوْرِهَا وَ یَوْمَ حَیَّانَ اَخِیْ جَابِرِ

فَیَا عَجَبًا بَیْنَا هُوَ یَسْتَقِیْلُهَا فِیْ حَیَاتِهٖ اِذْ عَقَدَهَا لِاٰخَرَ بَعْدَ وَفَاتِهٖ لَشَدَّ مَا تَشَطَّرَا ضَرْعَیْهَا فَصَیَّرَهَا فِیْ حَوْزَةٍ خَشْنَاءَ یَغْلُظُ کَلْمُهَا وَ یَخْشُنُ مَسُّهَا وَ یَکْثُرُ الْعِثَارُ فِیْهَا وَ الْاِعْتِذَارُ مِنْهَا فَصَاحِبُهَا کَرَاکِبِ الصَّعْبَةِ اِنْ اَشْنَقَ لَهَا خَرَمَ وَ اِنْ اَسْلَسَ لَهَا تَقَحَّمَ فَمُنِیَ النَّاسُ لَعَمْرُ اللّٰهِ بِخَبْطٍ وَ شِمَاسٍ وَ تَلَوُّنٍ وَ اعْتِرَاضٍ فَصَبَرْتُ عَلٰی طُوْلِ الْمُدَّةِ وَ شِدَّةِ الْمِحْنَةِ.

''یہاں تک کہ پہلا شخص اپنے راستے پر روانہ ہو گیا اور اس نے اپنے بعد خلافت اس شخص کو تحفے کے طور پر دے دی۔'' یہاں امامؑ نے مثال کے طور پر اعشیٰ کا شعر پڑھا'' کتنا فرق ہے کل اور آج میں، کل میں بھائی کے ساتھ خوش وخرم تھا اور آج سختیوں اور مصائب میں گھرا ہوا ہوں۔ (رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں میرا اتنا احترام کیا جاتا تھا کہ تمام لوگوں سے زیادہ مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت کا اعزاز نصیب تھا لیکن آج لوگوں نے مجھے اس حد تک نظر انداز کر دیا کہ خلافت تک کو مجھ سے پوچھے بغیر ایک دوسرے کو سونپ رہے ہیں۔)

حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں، جس چیز سے لوگوں سے معذرت کر رہا تھا اور درخواست کر رہا تھا کہ

---

[1] ان نشستوں (کانفرنس) میں زیر بحث آنے والے اہم موضوعات اور باہمی اتفاق کے بارے میں مکمل آگاہی حاصل کرنے کے لیے ''مجلہ پیامِ حوزہ، پیش شمارہ (نمبر شروع ہونے سے پہلے)'' کو دیکھیے۔

اسے اس کام (خلافت) سے الگ کر دیا جائے، اسی کو مرتے وقت دوسرے کے لیے طے کر گیا۔ بیشک دونوں نے مل کر شدت سے اس کے تھنوں کو دوہا ہے اور اب ایک ایسی درشت اور سخت منزل میں رکھ دیا ہے، جس کے زخم کاری ہیں اور جس کو چھونے سے بھی سختی کا احساس ہوتا ہے۔ لغزشوں کی کثرت ہے اور معذرتوں کی بہتات! اس کو برداشت کرنے والا ایسا ہی ہے، جیسے سر کش اونٹنی کا سوار کہ مہار کھینچ لے تو ناک زخمی ہو جائے اور ڈھیل دیدے تو ہلاکتوں میں کود پڑے۔ تو خدا کی قسم! لوگ ایک کجروی، سرکشی، تلوّن مزاجی اور بے راہ روی میں مبتلا ہو گئے ہیں اور میں نے بھی سخت حالات میں طویل مدت تک صبر کیا۔''

شرح وتفسیر

خلیفۂ دوّم کا دور

حضرت امام علی علیہ السلام اس خطبے کے دوسرے حصّے میں خلیفۂ دوّم کے دور کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حَتّٰی مَضَی الْاَوَّلُ لِسَبِیْلِہٖ'' حالات اسی طرح گزرتے گئے یہاں تک کہ پہلا فرد اپنی منزل کو سدھارا (دنیا سے کُوچ کر گیا) اسی راستے پر جس راستے پر سب کو جانا ہے۔ [۱]

پھر مزید اضافہ فرماتے ہیں:

''فَاَدْلٰی بِھَا اِلٰی فُلَانٍ بَعْدَہٗ''

''اُس نے اپنے بعد خلافت کو اُس شخص (یعنی خلیفۂ ثانی) کو تحفے کے طور پر دے دیا۔''

''اَدْلٰی'' (دَلو) کے مادّے سے بنا ہے۔ جس طرح سے کنویں سے پانی نکالنے کے لیے بالٹی اور رسّی کو استعمال کیا جاتا ہے، اسی طرح عربی کا یہ لفظ (دَلو) وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں کسی کو (انعام) اجرت یا رشوت دینے کی بات ہو، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا: ''وَتُدْلُوْا بِھَا اِلَی الْحُکَّامِ'' [۲] اس مقام پر پہنچ کر ''ابن ابی الحدید معتزلی'' کہتا ہے:

خلیفۂ دوّم کی خلافت دراصل اُن کو خلیفۂ اوّل کا تحفہ تھا، یہ اُن کاموں کے بدلے میں انعام تھا، جو خلیفۂ دوّم نے خلیفۂ اوّل کے لیے انجام دیے تھے، یہ خلیفۂ دوّم ہی تھے جنھوں نے خلیفۂ اوّل کی خلافت کی بنیاد کو مضبوط اور مستحکم کیا تھا اور

---

[۱] سن ۱۳ ہجری قمری میں، تقریباً ۲ سال اور ۳ ماہ (دورانِ خلافت خلیفۂ اوّل، ماہِ جمادی الثانی میں دنیا سے کُوچ کر گئے۔ (تاریخ مروّج الذّہب، مصنّف: مسعودی: جلد ۲، ص ۳۰۴، طباعت چہارم)

[۲] سورۂ بقرہ: آیت ۱۸۸

اُن کے مخالفین کو نیچا دکھایا تھا۔ زبیر کی تلوار کو توڑنے والے، مقدادؓ کو پیچھے ہٹانے والے، اور سقیفہ میں سعد بن عبادہ کو زدوکوب کرتے ہوئے یہ بات کہنے والے کہ سعد کو قتل کردو۔ خدا اسے قتل کرے، خلیفۂ دوّم کے کام تھے، جب حباب بن منذر نے سقیفہ کے واقعے کے دن یہ بات کہی، خلافت کے بارے میں اچھا خاصہ تجربہ اور آگاہی میرے پاس ہے، تو خلیفۂ دوّم نے اُس کی ناک پر ایک تھپڑ رسید کیا اور اُسے خاموش کرادیا۔

خاندانِ ہاشم سے جن لوگوں نے حضرت فاطمہؑ کے گھر میں پناہ لے رکھی تھی، اُنھیں خلیفۂ دوّم نے ڈرا دھمکا کر، وہاں سے باہر نکالا، یہاں تک کہ ابن ابی الحدید لکھتا ہے:

"وَلَوْلَاهُ لَمْ يَثْبُتْ لِاَبِيْ بَكْرٍ اَمْرٌ وَلَا قَامَتْ لَهُ قَائِمَةٌ"

''اگر وہ (خلیفۂ دوّم) نہ ہوتے تو حضرت ابوبکر کا کوئی کام بھی نہ بنتا اور ان کی خلافت کا کوئی ستون اپنی جگہ نہ ہوتا۔''[1] اس

اس کے بعد امام الکلام حضرت علی علیہ السلام عرب کے مشہور شاعر ''اعشیٰ'' کے ایک شعر کو بطور مثال بیان فرماتے ہیں:[2]

شَتَّانَ مَا يَوْمِيْ عَلٰى كُوْرِهَا وَيَوْمَ حَيَّانَ اَخِيْ جَابِرِ

آج میں دل گرفتہ ہوں گھر میں کل تھا خوش صحبتِ برادر میں

حضرت امام علی علیہ السلام اس مثال سے یہ بات سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں، میں اتنا زیادہ قابلِ احترام تھا کہ جتنا میں خدا کے حبیبؐ سے قریب تھا، کوئی دوسرا اتنا قریب نہ تھا، بلکہ (جیسا کہ خود خدا کے رسولؐ نے فرمایا تھا) میں تو ''نفسِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' تھا (یعنی جیسا کہ رسولؐ نے فرمایا تھا کہ اے علیؑ! میں اور تم اس اُمّت کے باپ ہیں) لیکن رسولؐ کے بعد مجھے پیچھے کردیا گیا اور بالکل تنہا چھوڑ دیا گیا۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید: جلد ۱، ص ۱۷۴

[2] اعشیٰ، زمانۂ جاہلیت کا مشہور شاعر ہے، ''یونس نحوی'' سے سوال کیا گیا سب سے بہترین اور برتر شاعر کون ہے؟ تو ''یونس'' نے جواب دیا، میں کسی خاص فرد کو معین نہیں کرسکتا لیکن ہر شاعر کو اُس کی خاص صفات میں باکمال سمجھا جاسکتا ہے۔ میرا کہنا یہ ہے، بہترین شاعر ''امراءُ القیس'' ہے جبکہ وہ سوار ہو، اور بہترین شاعر ''نابغہ'' ہے جبکہ وہ خوف کی حالت میں ہو، اور بہترین شاعر ''زہیر'' ہے جبکہ وہ کسی چیز سے دل لگالے، اور بہترین شاعر ''اعشیٰ'' ہے، جس وقت وہ مست (طرب) کی حالت میں ہو۔ جب اسلام کا ظہور ہوا تو ''اعشیٰ'' زندہ تھا لیکن اُسے اسلام قبول کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اس کی نظر کمزور تھی لہٰذا اس کو ''اعشیٰ'' کا نام دے دیا گیا، عمر کے آخری حصّے میں وہ مکمل نابینا ہوگیا تھا۔ اس کا اصلی نام ''میمون بن قیس'' تھا۔ مذکورہ بالا شعر میں اس زمانے کی طرف اشارہ ہے کہ جب ''اعشیٰ''، ''جابر'' کے بھائی ''حیان'' کا ہم نشین تھا۔ ''جابر کو ''یمامہ'' کے بڑوں اور بزرگ شخصیتوں میں شمار کیا جاتا تھا جبکہ ''اعشیٰ'' کو ایسے بڑے لوگوں کی ہم نشینی حاصل تھی یعنی اعشیٰ خود اُس وقت احترام اور نعمتوں کی فراوانی میں مست تھا اور پھر وہ اپنی اس پُرسکون زندگی کا موازنہ اپنی مکّے اور مدینے کے بیابانوں کی زندگی سے کرتا ہے کہ جب اُسے اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے، اونٹ پر سوار ہونا پڑتا تھا اور صحرا کی خاک چھاننی پڑتی تھی، لہٰذا وہ اپنی ان دو طرح کی زندگی کے بارے میں کہتا ہے ''ایکیہ مشقّت آمیز زندگی کہاں اور ایک وہ پُرآسائش زندگی کہاں!!''

بعض افراد کا خیال ہے کہ مولائے کائناتؑ نے عربی شعر کی مثال سے یہ بات سمجھانا چاہی ہے کہ خلفائے ثلاثہ کے زمانے میں حالات پھر بھی پُرامن اور مشکلات کم تھیں، لیکن حضرت علیؑ کے زمانۂ خلافت میں، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے زیادہ فاصلہ ہونے کی وجہ سے مشکلات بھی بڑھ چکی تھیں اور دوسری طرف سے دشمنوں اور منافقوں کی طرف سے جنگوں، سازشوں اور اختلافات کو ہوا دینے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ اس رائے کو اُس صورت میں صحیح مانا جا سکتا ہے کہ اگر ''اعشیٰ'' نے اپنے حالات کا ''حیان'' کے حالات کے ساتھ موازنہ کیا ہوتا۔ [1]

اور پھر ''امامِ جنّ وانس'' سب سے زیادہ جس بات پر تعجب کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ فرماتے ہیں:

''فَيَا عَجَبًا! بَيْنَا هُوَ يَسْتَقِيلُهَا فِي حَيَاتِهِ إِذْ عَقَدَهَا لِآخَرَ بَعْدَ وَفَاتِهِ''

''تعجب اور حیرت کی بات یہ ہے کہ جو شخص اپنی زندگی میں عوام الناس سے معذرت کا اظہار کرتا ہے اور خلافت سے کنارہ کشی چاہتا ہے، موت کے وقت ''خلافت کی مسند کو دلہن کی طرح سجا کر'' دوسرے کو بطور انعام پیش کر رہا ہے۔''

یہ کلامِ امامِ معصومؑ اُس مشہور حدیث کی طرف اشارہ ہے، جس میں حضرت ابوبکر نے اپنی خلافت کے آغاز میں لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''أَقِيلُونِي فَلَسْتُ بِخَيْرِكُمْ''

''مجھے خلافت سے معاف رکھو، میں تم لوگوں میں سے بہترین فرد نہیں ہوں۔''

بعض افراد نے خلیفۂ اوّل کے پہلے خطبے کو یوں نقل کیا ہے: ''وَلِّيتُكُمْ وَلَسْتُ بِخَيْرِكُمْ'' مجھے خلافت کے

[1] شرح نہج البلاغہ، مصنّف: ابن میثم بحرانیؒ: جلد ۱، صفحہ ۲۵۷

لیے منتخب کیا گیا ہے جبکہ میں تم سب سے بہتر (اور قابل) انسان نہیں ہوں۔ [1]

یہ روایت جس انداز اور جن الفاظ میں بھی بیان ہوئی ہو، لیکن ایک بات تو ہر زاویے سے ثابت ہو جاتی ہے کہ خلیفۂ اوّل، خلافت کے لیے بذاتِ خود تیار نہیں تھے یا بعض لوگوں کا اندازہ ہے کہ خلافت سے لاتعلقی اور بے نیازی تھی یا یہ کہ حضرت علیؑ کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو اس عہدے کے لیے شائستہ اور حقدار نہیں سمجھتے تھے۔ بہر حال اس میں سے کسی بھی رائے اور نظریئے کو صحیح مانیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ''خلیفۂ اوّل'' کی یہ گفتگو اور اُن کی زندگی کے آخری دنوں میں خلیفۂ دوّم کو اپنا جانشین معیّن کرنے کا عمل آپس میں کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔

یہی وہ نکتہ ہے جس پر امام علیؑ حیران ہیں اور تعجب کا اظہار فرماتے ہیں کہ اگر خلیفۂ اوّل خلافت کے مسئلے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے تو یہ اچانک، عوام و خواص نیز پوری اُمّتِ مسلمہ سے مشورے کے بغیر اور اُن کی پسند و ناپسند جانے بغیر کیسے راتوں رات، آناً فاناً خلافت کے ایک شخص سے دوسرے تک منتقل ہونے کے سارے مراحل طے ہو گئے اور ''جنّ و بشر میں سے کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔'' (اور خلافت کے اعلان کے بعد عوام الناس کو بیعت کرنے کے لیے کہا گیا) اپنی گفتگو کے اس حصے کے آخر میں فرماتے ہیں: ''لَشَدَّ مَا تَشَطَّرَا ضَرْعَيْهَا''

'' کتنے اطمینان کے ساتھ ان دونوں نے باری باری خلافت سے فائدہ اُٹھایا اور اِس اونٹنی (خلافت) کے تھنوں

---

[1] یہ ایک ایسی حدیث ہے جو کثرت سے کتب شیعہ و سنّی دونوں میں نقل ہوئی ہے: ابنِ ابی الحدید نے اپنی شرحِ نہج البلاغہ میں دونوں الفاظ کے ساتھ اس حدیث کو بیان کیا ہے۔ (شرحِ نہج البلاغہ، ابنِ ابی الحدید: جلد ۱، صفحہ ۱۶۹)

''شیخ محمد عبدہٗ'' بزرگ مصری دانشور اپنی شرحِ نہج البلاغہ میں کہتے ہیں: بعض افراد نے روایت کی ہے کہ ''حضرت ابوبکر'' نے بیعت کے بعد کہا ''اَقِيْلُوْنِيْ فَلَسْتُ بِخَيْرِكُمْ'' ''مجھے معاف کرو میں تم سب سے بہتر نہیں ہوں''۔ لیکن اکثر دانشوروں نے اس روایت کو اس شکل میں قبول نہیں کیا ہے اور ان کا کہنا ہے، روایت یوں ہے ''وَلَّيْتُكُمْ وَلَسْتُ بِخَيْرِكُمْ'' ''مجھے تمہارا سرپرست بنایا گیا ہے جبکہ میں تم لوگوں سے بہتر نہیں ہوں''۔ شرحِ نہج البلاغہ: عبدہ، صفحہ ۸۶، اسی خطبے کے ضمن میں یہ ساری گفتگو موجود ہے۔

کتاب ''دُرَرُ بحر المناقب'' میں محدّث ''حنفی موصلی'' نے ''ابنِ حسنویہ'' سے، کتاب ''احقاق الحق'' کے حاشیوں میں، اس موضوع سے متعلق ایک تفصیلی حدیث بیان کی ہے، اس حدیث کے آخر میں تحریر ہے کہ حضرت ابوبکر نے کہا ''اَقِيْلُوْنِيْ فَلَسْتُ بِخَيْرِكُمْ وَ عَلِيٌّ فِيْكُمْ'' مجھے چھوڑو! کیونکہ میں تم میں سے بہترین شخص نہیں اور جبکہ علیؑ بھی تمہارے درمیان موجود ہیں۔ احقاق الحق: جلد ۸، صفحہ ۲۴۰۔

مشہور مورّخ ''طبری'' لکھتا ہے، بیعتِ ''سقیفہ'' کے بعد حضرت ابوبکر نے خطبہ دیا اور کہا: ''اَيُّهَا النَّاسُ فَاِنِّيْ قَدْ وُلِّيْتُ عَلَيْكُمْ وَلَسْتُ بِخَيْرِكُمْ'' اے لوگو! مجھے تم لوگوں کے لیے خلیفہ چنا گیا ہے، جبکہ میں تم لوگوں میں سے بہترین فرد نہیں ہوں۔ تاریخ طبری: جلد ۲، صفحہ ۴۵۰، طباعت، مؤسسہ علمی بیروت۔

''ابنِ قتیبہ دینوری'' اپنی کتاب ''الامامۃ والسیاسۃ'' میں نقل کرتا ہے کہ حضرت ابوبکر نے روتے ہوئے، لوگوں سے کہا ''لَا حَاجَةَ لِيْ فِيْ بَيْعَتِكُمْ اَقِيْلُوْنِيْ بَيْعَتِيْ'' مجھے تم لوگوں کی بیعت کی کوئی حاجت نہیں، میری بیعت کو واپس کر دو۔ (الامامۃ والسیاسۃ۔ جلد ۱، صفحہ ۲۰)

سے اپنے اپنے حصّے کے مطابق دودھ نکالا۔''

''ضَرْع'' سے مراد پستان (تھن) ہے اور ''تَشَطَّرَا'' شطر کے مادّے سے ہے، جس کے معنی ہیں ''کسی چیز کا کچھ حصّہ'' یہ خوبصورت تشبیہ، پڑھنے اور سمجھنے والے کے ذہن کو بات کی گہرائی تک پہنچا دیتی ہے، اس تشبیہ کو وہاں استعمال کیا جاتا ہے، جہاں یہ بتانا مقصود ہو کہ ''کچھ لوگ باری باری کسی چیز کو استعمال میں لاتے ہیں''۔ دراصل اُونٹنی کے چار تھن ہوتے ہیں؛ یہ جوڑی کی شکل میں دو آگے اور دو پیچھے ہوتے ہیں اور عام طور سے دودھ نکالتے وقت، دو دو تھنوں کو ایک ساتھ پکڑ کر دودھ نکالا جاتا ہے۔ کلامِ امامؑ میں ''دو تھنوں'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے عربی میں ''تَشَطَّرَا'' کا لفظ آیا ہے یعنی اُن دو افراد خلیفۂ اوّل و دوّم میں سے ایک نے اپنے حصّے کو استعمال کیا اور بقیہ حصّہ دوسرے کے لیے چھوڑ دیا، بہر حال نتیجہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ سب کچھ اتفاقی طور پر رونما نہیں ہوا، بلکہ پہلے سے سب کچھ طے شدہ تھا۔

ایک سوال کا جواب:

بعض افراد نے اس مقام پر بالکل وہی بات دوہرائی ہے، جو خلیفۂ اوّل کے بارے میں کہی گئی تھی کہ خلیفۂ اوّل لوگوں سے اپنی بیعت واپس لینا چاہتے تھے، کیونکہ وہ ان میں سے سب سے بہتر فرد نہیں تھے۔ اور یہی بات حضرت علی علیہ السلام نے اسی نہج البلاغہ میں، قتل خلیفۂ سوّم کے بعد لوگوں سے یوں فرمائی ہے:

''دَعُوْنِیْ وَ الْتَمِسُوْا غَیْرِیْ وَ اِنْ تَرَکْتُمُوْنِیْ فَاَنَا کَاَحَدِکُمْ وَ لَعَلِّیْ اَسْمَعُکُمْ وَ اَطْوَعُکُمْ لِمَنْ وَلَّیْتُمُوْهُ اَمْرَکُمْ وَ اَنَا لَکُمْ وَزِیْرًا خَیْرٌ لَکُمْ مِنِّیْ اَمِیْرًا''

''مجھے چھوڑ دو، کسی اور کو تلاش کرو، اگر مجھے چھوڑ دو گے تو میں بھی تم میں سے ایک ہو جاؤں گا، اور شاید میں تم سب سے زیادہ سننے والا، نیز اطاعت کرنے والا ہوں گا اُس فرد کا جس کا تم سب انتخاب کرو گے، میں تم لوگوں کا وزیر اور مشاور (مشورہ دینے والا) بن جاتا ہوں، یہ تم لوگوں کے لیے (اُس وقت کے لوگوں کے مزاج کے مطابق یہ بات ان کے لیے زیادہ بہتر تھی، اس سے بہتر ہے کہ میں تم لوگوں پر حاکم (امیر) یا تم لوگوں کا رہبر بن جاؤں۔''

یہاں پر ایک بات ابن ابی الحدید نے کہی ہے اور ایک بات ہماری بھی ہے، وہ کہتا ہے:

''شیعۂ امامیہ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ خلیفہ اوّل کی گفتگو اور حضرت علی علیہ السلام کی گفتگو میں بڑا فرق ہے۔ خلیفۂ اوّل نے کہا کہ میں تم میں سے بہترین فرد نہیں ہوں لہٰذا خلافت کے لیے صلاحیت نہیں رکھتا، کیونکہ خلیفہ کو سب سے زیادہ صالح ہونا چاہیے، لیکن حضرت علیؑ نے ہرگز ایسی کوئی بات نہیں کہی، وہ نہیں چاہتے تھے کہ خلافت قبول کرنے کے

ذریعے، فتنہ انگیزی کرنے والوں کو بہانہ ملے اور وہ لوگ فتنہ برپا کریں۔''[1]

ابنِ ابی الحدید مزید اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ بات اُس صورت میں صحیح ہے کہ اگر افضلیت، امامت کی شرط مان لی جائے یعنی ممکن ہے کہ کوئی اس بات کا قائل ہو کہ ضروری نہیں کہ امامؑ افضل ہو۔

یہ ایسی بات ہے جو عقل و منطق سے بالکل عاری ہے اور اس کا اظہار بھی مضحکہ خیز ہے، لیکن ہم تو یہ کہتے ہیں کہ بات اس سے بھی کہیں آگے بڑھ گئی ہے۔ اگر اسی خطبہ ۹۲ پر کہ جس میں یہ استدلال کیا گیا ہے، ذرا غور کر لیجیے اور اُس میں جو جملے موجود ہیں، نیز جس قسم کی عبارات استعمال کی گئی ہیں، بالخصوص وہ جملے جو عربی قواعد اور قرائن کے مطابق حذف کر دیے گئے ہیں، ان کو بھی مدّنظر رکھا جائے، تو کلامِ امامؑ کی دلیل واضح اور روشن تر ہو جائے گی۔

آپؑ پوری صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں:

''فَاِنَّا مُسْتَقْبِلُوْنَ اَمْرًا لَهُ وُجُوْهٌ وَّ اَلْوَانٌ لَا تَقُوْمُ لَهُ الْقُلُوْبُ وَلَا تَثْبُتُ عَلَيْهِ الْعُقُوْلُ''

(یہ جو میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے چھوڑ دو اور کسی اور کو تلاش کرو، اس کی وجہ یہ ہے کہ) ہم ایسی حقیقت کا سامنا کرنے والے ہیں، جس کے مختلف چہرے ہوں گے اور مختلف پہلو ہوں گے، زندگی کے ان حقائق کو دیکھ کر نہ دلوں کو قرار ہوگا، نہ عقلوں کو استحکام ہوگا۔''

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سے لے کر اب تک، اسلام کے احکام اور پیغمبر اسلامؐ کی دی گئی تعلیمات میں اتنی زیادہ تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں کہ کوئی چارہ نہیں، مگر یہ کہ میں انقلابی انداز میں حالات کی بہتری کے لیے ضروری اقدامات انجام دوں اور تمہارے مختلف گروہوں کی مخالفت مول لوں۔

پھر اضافہ فرماتے ہیں:

''وَاِنَّ الْآفَاقَ قَدْ اَغَامَتْ وَ الْمَحَجَّةَ قَدْ تَنَكَّرَتْ''

''کیونکہ حقیقت کے چہرے کو سیاہ بادلوں نے ڈھانپ لیا تھا اور حق کا سیدھا راستہ دھندلا چکا تھا اور اسلام کا حُسن و جمال ناقابلِ پہچان ہو کر رہ گیا تھا۔''

اور اس کے بعد جو جملہ پوری صراحت کے ساتھ مولائے کائناتؑ نے فرمایا ہے، پورے کلام کی جان اس میں جھلک رہی ہے:

'' وَاعْلَمُوْا اَنِّیْ اِنْ اَجَبْتُكُمْ رَكِبْتُ بِكُمْ مَا اَعْلَمُ وَلَمْ اُصْغَ اِلٰى قَوْلِ الْقَائِلِ وَعَتْبِ

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید: جلد ۱، صفحہ ۱۶۹

الْعَاتِبِ"

''آپ لوگ جان لیجیے، اگر میں نے آپ لوگوں کی دعوت (خلیفہ بننے کے مطالبے) کو قبول کر لیا تو میں اپنے علم کے مطابق آپ لوگوں کے ساتھ برتاؤ کروں گا (ایک ان پڑھ انسان کی طرح نہیں) ایسا ہرگز نہیں کروں گا کہ سُنی سنائی باتوں پر کان دھروں اور بے بنیاد فیصلے کروں۔''

لہٰذا تم لوگ اچھی طرح سوچ سمجھ لو میں تم لوگوں کو کسی غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہتا ہوں؛ تم لوگوں کو میری بیعت کرنا بہت مہنگا پڑے گا؛ اگر تمہارے دل و دماغ راضی نہیں تو میرے علاوہ کسی اور کو تلاش کر لو۔ اس بات کا ثبوت بھی موجود ہے کہ حضرت علی علیہ السلام خلافت کے بارے میں افضلیت کو لازم اور واجب سمجھتے ہیں، جیسا کہ ایک دوسرے خطبے میں امامِ عدل و انصاف فرماتے ہیں:

"اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ اَحَقَّ النَّاسِ بِهٰذَا الاَمْرِ اَقْوَاهُمْ عَلَیْهِ وَ اَعْلَمُهُمْ بِاَمْرِ اللّٰهِ فِیْهِ"[1]

''اے لوگو! امامت اور خلافت کے لیے سب سے زیادہ مناسب اور لائق انسان وہ ہوتا ہے، جو اس ذمّے داری کو نبھانے میں اور تمام لوگوں سے ہر لحاظ سے باصلاحیت، ہوشیار اور سمجھدار نیز تجربہ کار ہو اور احکامِ خدا کو جاننے میں دیگر تمام انسانوں سے زیادہ عالم ہو۔''

(عالم، علم سے ہے یعنی قول و فعل اور ایمان میں اتنا سچا ہو کہ اُس سے زیادہ کوئی شخص خدا کے قریب نہ ہو) لہٰذا اگر عدل و انصاف کے ساتھ بات کو پرکھا جائے تو، حضرت علیؑ اور حضرت ابوبکر کے کلام کا آپس میں کوئی مقابلہ نہیں، عربی زبان کی اصطلاح کے مطابق یہ "قِیَاسٌ مَعَ الْفَارِقِ" ہے یعنی دو ایسی چیزوں کا آپس میں موازنہ کیا جاتا ہے، جن میں آپس میں کوئی برابری اور شباہت پائی جائے، لیکن یہاں ایسا کچھ نہیں، ان دونوں کلاموں کا قبلہ بھی مختلف ہے اور مقصد بھی متضاد ہے۔

ایک اور مقام پر ابن ابی الحدید، خلیفۂ اوّل کے کلام کی توجیہہ پیش کرتا ہے، ہم اس بات کو اُس کی توجیہ بیان کرنے کے ساتھ مکمل کر رہے ہیں۔ ابنِ ابی الحدید کہتا ہے:

''جو لوگ امامت کے بارے میں افضلیت کو شرط نہیں مانتے، ان کی نظر میں اس روایت پر کوئی اعتراض عائد نہیں ہوتا، بلکہ ایسے لوگ تو اس حدیث کو اپنے عقائد میں شمار کرتے ہیں کہ خلیفۂ اوّل نے کہا ہے کہ مجھے امامت کے لیے منتخب کیا گیا ہے جبکہ میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں، اور جن لوگوں نے "اَقِیْلُوْنِی" کی روایت کو قبول کیا ہے، اُن کے مطابق یہ گفتگو سنجیدہ نہیں تھی، بلکہ اس بات سے خلیفۂ اوّل کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو آزمائیں اور یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ

---

[1] نہج البلاغہ: خطبہ ۱۷۳

میرے بارے میں رائے عامّہ کیا ہے؟ کون میرا حمایتی ہے اور کون مخالف ہے، کون خیر خواہ ہے اور کون دشمن ہے۔''[1]

ایسی توجیہات کا بے بنیاد ہونا بھلا کس سے پوشیدہ ہے، کیونکہ کسی فرد کے اعتراف کو ہمیشہ اُس کے واقعی معنی کے آئینے میں سمجھنا چاہیے اور توجیہہ کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے واضح اور روشن قرینہ چاہیے، جو کہ اس مقام پر (خلیفۂ اوّل کے کلام میں) موجود نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ اعتراف ہر عدالت میں ایک اعتراف کے عنوان سے واقعی اور حقیقی اعتراف سمجھا جائے گا، اور اس کے بارے میں کسی بھی قسم کا کوئی عذر قابلِ قبول نہیں سمجھا جائے گا مگر یہ کہ کوئی واقعی اور واضح دلیل اور ثبوت ہو۔ اور اس کے بعد خلیفۂ دوّم کی شخصیت، اُن کی صفات اور خصوصیات نیز اُن کے زمانے کے حالات، مسائل اور ماحول کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''فَصَيَّرَهَا فِي حَوْزَةٍ[2] خَشْنَاءَ يَغْلُظُ كَلْمُهَا[3] وَ يَخْشُنُ مَسُّهَا يَكْثُرُ الْعِثَارُ[4] فِيهَا، وَ الْاِعْتِذَارُ مِنْهَا''

''اُس (خلیفۂ اوّل) نے ایسے فرد کے ہاتھ میں خلافت دی کہ جو سخت مزاج کا مالک تھا، سخت گیری کی فطرت تھی، بار بار غلطی کرنا اور بار بار معذرت چاہنا اُس کا رویّہ تھا۔''

عربی لفظ ''حَوْزَةٍ'' سے مراد یہ ہے کہ خلیفۂ دوّم کا پورا مزاج اور شخصیت دراصل چار صفات پر مشتمل ہے:

پہلی صفت: ''يَغْلُظُ كَلْمُهَا'' کے ذریعے بیان کی گئی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسا انسان کہ جس کا مزاج یہ ہے کہ اگر کوئی اُس سے ملاقات کرے تو جسمانی اور روحانی لحاظ سے شدید مجروح ہو جاتا ہے۔

دوسری صفت: ''وَ يَخْشُنُ مَسُّهَا'' کے ذریعے بیان کی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ خلیفۂ دوّم کے بارے میں ''حَوْزَةٍ خَشْنَاءَ'' شدّت آمیز صفات کا مالک استعمال کی گئی ہے اور اس کے بعد دو جملوں میں اس کی تفسیر کی گئی ہے کہ ''گفتگو میں انتہائی سختی اور برتاؤ میں انتہا پسندی پائی جاتی ہے۔

تیسری صفت: بار بار غلطیاں کرنا ہے جیسے ''يَكْثُرُ الْعِثَارُ فِيهَا'' کثرت سے غلطیاں کرنا اس کا مزاج

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید: جلد ۱، ص ۱۶۹

[2] حوزۃ، کا مطلب ہے کہ (حدود اربعہ)، علاقہ، دائرہ، اختیارات نیز ''طبیعت اور مزاج'' یہ حیازت کے مادّے سے لیا گیا ہے، جس کے معنی ''جمع کرنا'' اور ''اخذ کرنا'' ہیں۔

[3] کلم، یعنی ''زخم اور صراحت'' اور کلام کے معنی میں یہ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ ہر کلام اپنے مدّمقابل پر گہرا اثر رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تلوار کا زخم بھر جاتا ہے لیکن زبان کا زخم کبھی نہیں بھرتا ہے۔

[4] عثار، یعنی لغزش، غلطی۔

تھا، یہ بیان کیا گیا ہے۔

چوتھی صفت: بار بار معذرت چاہنا ہے، جیسے "وَ الْاِعْتِذارُ مِنْهَا" کثرت سے معذرت چاہنا بھی اُس کے مزاج کی مجبوری تھی۔

خلیفۂ دوّم کا کثرت سے غلطیاں کرنا خاص طور سے احکامِ اسلام بیان کرنے کے بارے میں ہے اور پھر معذرت چاہنا، تاریخ اسلام ان حقائق سے بھری ہوئی ہے، حتیٰ کہ اہلسنّت کے دانشور حضرات کی کثیر کتب اس موضوع پر دستیاب ہیں، ''نکات'' کے ضمن میں ان غلطیوں کا ذکر ہوگا۔ اِن شاء اللہ۔

اس کے بعد حضرت امام علی علیہ السلام اضافہ فرماتے ہیں:

"فَصَاحِبُهَا كَرَاكِبِ الصَّعْبَةِ[۱] اِنْ اَشْنَقَ[۲] لَهَا خَرَمَ[۳]، وَاِنْ اَسْلَسَ[۴] لَهَا تَقَحَّمَ"[۵]

''جس کسی کا خلیفۂ دوّم کے اس نظامِ خلافت سے کوئی واسطہ تھا تو اس کی مثال اُس شخص جیسی تھی جو ایک سرکش اونٹ پر سوار ہو، اگر وہ اُس کی مہار کو مضبوطی سے کھینچتا ہے تو اونٹ کی ناک کے نتھنے پھٹ جاتے ہیں اور اگر وہ اونٹ کی مہار کو ڈھیلا چھوڑ دے تو کسی جان لیوا گہری کھائی میں جا گرے گا اور یوں وہ خود اور جو لوگ اُس کے ساتھ ہیں، سب کو موت کے منہ میں دھکیل دیتا ہے۔''

امامِ دین وسیاست اس جملے میں، خلیفۂ دوّم کے زمانۂ خلافت میں اپنا اور مومنین کے ایک گروہ کا حال بیان کرتے ہوئے تشریح فرماتے ہیں، جیسا کہ خلیفہ کی گفتار اور کردار کے حوالے سے جو مزاج اور خصوصیات اوپر بیان کی جا چکی ہیں، ان کے مطابق، اگر کوئی خلیفہ سے مقابلے کے لیے کھڑا ہوتا تو اختلاف، لڑائی جھگڑا ہوتا اور عین ممکن تھا کہ مسلمانوں کے درمیان شگاف پڑ جاتا یا خلیفہ کی جانب سے کچھ نہ کچھ جوابی کارروائی یا خطرے، مخالفت کرنے والے کے لیے ضرور پیش آتے اور اگر، خاموشی اختیار کی جاتی اور اس طرح ہر چیز سے راضی ہونے اور مطمئن ہونے کا اظہار کیا جاتا تو پھر دوسری جانب سے اسلام اور

---

[۱] صعبۃ، یعنی سرکش انسان یا حیوان، اس لفظ کا عربی میں متضاد ذلول، ہوتا ہے یعنی رام اور سدھایا ہوا ہونا (فرماں بردار) اور یہاں صعبۃ، سے مراد سرکش اُونٹ ہے۔

[۲] اشنق، یعنی اونٹ کی لگام کھینچنا اور اس سے ملتے جلتے معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور، شناق، جو کتاب کے وزن پر ہے، ایسی رسّی کے لیے استعمال ہوتا ہے جس سے مشکیزے کا منہ باندھا جاتا ہے۔

[۳] خَرَم، خَرم کے مادّے سے بنا ہے، جس کا وزن نرم ہے اور اس کے معنی پھاڑنا اور شگافتہ کرنا ہیں۔

[۴] اَسَلس، سَلَس کے مادّے سے ہے، اس کا وزن قفس ہے اور سلاسۃ کے معنی ہیں سہولت اور آسانی۔ اس لیے اَسَلَس کے معنی ہوتے ہیں، ''چھوڑ دیا اور مسئلے کو آسان اور معمولی سمجھا''۔

[۵] تَقَحَّمَ، قحوم کے مادّے سے لیا گیا ہے اس کا وزن شعور ہے اور معنی کسی کام یا مسئلے میں بغیر سوچے سمجھے کود پڑنا ہے۔

اسلامی خلافت پر بہت سے خطرے منڈلا رہے تھے۔

اُس وقت کا معاشرہ حقیقت میں تو ہمیشہ ان دو خطروں کے درمیان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے جملوں میں زمانہ شناس امامؑ اپنی بے قراری اور اُس زمانے کے لوگوں کی بڑھتی ہوئی مشکلات اور شکایات کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ جن پر روز بروز زندگی تنگ ہوتی جارہی تھی، نیز قرآن وسنّت کو عوام وخواص بھولتے جارہے تھے جبکہ اسلام اور اُس کی تعلیمات کا بس نام رہ گیا تھا۔

لفظ "صَاحِبُهَا" میں ضمیر "هَا" مطلق خلافت سے متعلق ہے یعنی خلافت کے مزاج اور اس کی طبیعت میں ہمیشہ یہ دو خطرے پنہاں ہیں۔ وہ شخص جو خلافت کی مسند پر بیٹھا ہے، اگر یہ چاہے کہ ہر چیز کے ساتھ اور ہر مسئلے کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھے اور سو فیصد نظم وضبط پر عمل درآمد کروایا جائے تو شدید ردّعمل آنے کے خطرات موجود ہیں، اور اگر یہ چاہے کہ چشم پوشی، سہولت اور نرمی کا برتاؤ رکھا جائے تو بھی انحرافات اور دوسرے قسم کے خطرات کی گہری کھائی اُس کی منتظر ہے، نیز اسلامی آداب، تہذیب وثقافت اور تعلیمات کے محو ہونے کے خطرے سر پر منڈلا رہے ہوں گے، لیکن قرینہ یہ بتاتا ہے کہ حضرت امام علیؑ کی مراد وہی پہلے معنی ہیں اور اگر پہلے اور بعد کے جملوں پر ذرا غور کرلیا جائے تو یہ بات باآسانی واضح ہوجاتی ہے۔[1]

اور پھر امامِ بیداری اور آگہی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی اور لوگوں کی اُس زمانے میں پریشانیوں اور مشکلات کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَمُنِيَ[2] النَّاسُ لَعَمْرُ اللهِ بِخَبْطٍ[3] وَشِمَاسٍ[4] وَتَلَوُّنٍ[5] وَاعْتِرَاضٍ"[6]

"قسم خدا کی! ان حالات اور مشکلات کی وجہ سے لوگوں کی پوری زندگی غیر متوازن ہوکر رہ گئی تھی، نیز بات یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ عوام سرکشی پر اُتر آئیں، حواس باختہ اور پریشان حال نیز غیر منظم حرکات وسکنات انجام دینا ان کی عادت بنتی

---

[1] بعض افراد نے یہاں ایک تیسرا خیال ظاہر کیا ہے کہ خلافت سے مراد حضرت امام علیؑ کا اپنا زمانہ ہے۔ آپؑ کے زمانے میں بھی یہی دو طرح کی مشکلیں موجود تھیں، لیکن یہ رائے بہت ہی بعید از قیاس ہے۔

[2] منی، منو کے مادّے سے ہے اس کا وزن بند ہے۔ اس کے معنی مبتلا ہونا اور مشکل میں پڑ جانا ہے۔

[3] خبط، اس کا مطلب ہے کہ اونٹ کا زمین پر پیر مارنا نیز لاپروائی کے ساتھ حرکات انجام دینا، اور اس عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ راستہ چلتے پاؤں ڈگمگا جائیں۔

[4] شماس، یعنی سرکشی اور بدخلقی۔

[5] تلوّن، یعنی رنگ اور حالت کا بدلنا۔

[6] اعتراض، اس کے معنی راستے پر چلنا ہے اور غیر مناسب اور بے ہنگم حرکات وسکنات۔

جارہی تھی۔''

اس جملے میں خلیفۂ دوّم کے زمانے میں، عوام الناس کی نفسیاتی کیفیات اور گفتار و کردار (چال چلن) کے چار بنیادی عناصر کو بیان کیا گیا ہے، عین ممکن ہے کہ اس نفسیاتی کیفیت اور بدلتے مزاج کی بنیادی وجہ خود حاکمِ وقت ہو، کیونکہ اکثر، حاکمِ وقت کی گفتار اور کردار براہِ راست عوام کو بنانے یا بگاڑنے میں غیر معمولی حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ قدیم زمانے سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ ''اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ'' عوام الناس عام طور سے اپنے حاکموں کے نقشِ قدم پر چلتے اور اُن کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگنا پسند کرتے ہیں۔

خلیفۂ دوّم کے زمانے میں عوام کے مزاج میں پیدا ہونے والے چار عناصر درج ذیل ہیں:

پہلی خاصیت: یہ تھی کہ اُس زمانے کے لوگوں کی حرکات وسکنات مطالعے کے ساتھ نہ تھیں، اور نہ ہی غور وفکر کے ساتھ تھیں، لہٰذا معاشرے میں مشکلات اور مسائل کا باعث بنیں۔

دوسری خاصیت: یہ تھی کہ خدائی قوانین (شریعت اور دین) اور اجتماعی نظام سے بیزاری اور سرکشی اُس زمانے کے لوگوں کا مزاج بن چکا تھا۔

تیسری خاصیت: یہ تھی کہ اُس زمانے کے لوگ حالات کے مطابق اپنا رنگ بدلنے لگے تھے، اپنا راستہ بدل لینا، وفاداریاں تبدیل کر دینا، ایک گروہ کو چھوڑ کر دوسرے گروہ کے ساتھ مل جانا ایک عام مزاج بن چکا تھا۔ مختصر یہ کہ زندگی کا کوئی مقصد نہ تھا، بغیر کسی زحمت کے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی ہوس رکھتے تھے۔

چوتھی خاصیت: یہ تھی کہ حق کے راستے کو ترک کر کے انحراف کا راستہ اختیار کر لیا جاتا تھا۔

تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو ہوگی کہ بلاشبہ خلیفۂ دوّم کے زمانے میں ''سیاستِ خارجی'' یعنی خارجہ پالیسی کی بنیاد یہ تھی کہ حجاز کے علاقے سے باہر پیشرفت کی جائے اور اسلامی فتوحات کے سلسلے کو آگے بڑھایا جائے، اس حکومت کے بارے میں یہ ایک ایسی ذہنیت بن گئی تھی کہ جس کو اکثر لوگ پسند کرنے لگے تھے، نیز ہر لحاظ سے اُسے ایک کامیاب حکومت سمجھتے تھے، جبکہ مسلمان معاشرے کے داخلی مسائل اور مشکلات کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔

مذکورہ بالا جملوں میں مولائے کائناتؑ نے ان مسائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جہالت، لاعلمی کی وجہ سے پے در پے غلطیاں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ قرآن اور سنت پیغمبرؐ کے نص کے مقابلے میں اپنے ذاتی اجتہاد پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ کیا اعتقاد اور کیا عمل، بلکہ اَخلاقی مسائل میں بھی انحرافات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ آہستہ آہستہ حقیقی اسلام سے فاصلہ بڑھتا چلا گیا، یہی وجہ تھی کہ خلیفۂ سوّم کے زمانے میں مسلمان عوام کی جانب سے شور وغل اُٹھا،

حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی اور پھر خلفائے اُموی اور عباسی جیسی خود سر حکومتوں کے لیے زمین پوری طرح ہموار ہوگئی، جو کسی بھی طرح رسولِ اسلامؐ کے زمانے میں اسلامی حکومت سے کوئی شباہت نہیں رکھتی تھیں۔ عالم اسلام میں یہ عجیب وغریب تبدیلیاں یقیناً ایک دن میں رونما نہیں ہوئیں، بلکہ یہ سب کچھ تدریجی طور پر خلفائے ثلاثہ کے زمانے سے شروع ہوا اور ان تمام مشکلات اور انحرافات کی بنیاد، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد رکھی گئی۔

سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے آپؑ فرماتے ہیں:

"فَصَبَرْتُ عَلٰی طُوْلِ الْمُدَّةِ، وَ شِدَّةِ الْمِحْنَةِ"

''ایسے حالات میں صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، اس کا طویل زمانہ اور درد ورنج شدید تھا۔ نیز صبر وشکیبائی اُس کا علاج تھا۔''

یہ زمانہ بھی خلیفۂ اوّل کے زمانے کی طرح تھا، لیکن خلیفۂ اوّل کا زمانہ مسائل اور مشکلات شروع ہونے کا زمانہ تھا۔ جبکہ خلیفۂ دوّم کے زمانے میں مسائل زیادہ پیچیدہ ہوگئے تھے اور کیونکہ اُن کا زمانۂ خلافت زیادہ طویل تھا، لہٰذا حضرت امام علیؑ فرماتے ہیں کہ خلیفۂ دوّم کے زمانے میں درد اور رنج زیادہ شدید ہوگئے تھے۔

نہج البلاغہ کے بعض شارحین کا کہنا ہے:

''امامِ عالی مقامؑ کا یہاں پر دو باتوں کی طرف اشارہ ہے، جن میں سے ہر ایک امامِ مظلوم کے لیے تکلیف اور اذیت کا باعث بنتی رہی ہے، پہلی مشکل امیر المومنینؑ کو مرکز خلافت اور اس کی ذمّے داریوں کی ادائیگی سے دور رکھا جانا اور خلافت کو آپؑ کی شخصیت سے جدا کرنے کی ظالمانہ کوششیں۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ جب ہر لحاظ سے ایک صالح اور باصلاحیت قیادت کو فکری اور عملی میدان میں عوام سے دور رکھا گیا نیز اِس ستم ظریفی کے نتیجے میں عوام کو جس محرومیت کا سامنا کرنا پڑا، تو پورے معاشرے کا نظام بگڑ کر رہ گیا، لیکن ان تمام وجوہات اور مشکلات کے باوجود، کچھ ایسی اعلیٰ مصلحتیں وجود رکھتی تھیں، جن کی وجہ سے حقائق کا اظہار اور احتجاج اور دنیا والوں تک پہنچانے کے بعد خاموشی اختیار کرنا ہی سب سے بڑی حکمت عملی سمجھا گیا۔''

چند نکات

ا۔خلیفۂ دوّم کا انداز اور طریقۂ کار

خلیفۂ دوّم کے حالاتِ زندگی کے بارے میں خاص طور سے اُن کے دورانِ خلافت کے واقعات میں، ہمیں اہل سنّت کے علماء اور صاحبانِ علم و دانش کی کُتب (کتب حدیث اور تاریخ) سے جو کچھ ملتا ہے، اُس کی مکمل طور پر امام علیؑ کے کلمات کے ذریعے تصدیق ہوتی ہے۔ان واقعات کی ایک لمبی چوڑی فہرست ہے، جن میں سے چند ایک واقعات درج ذیل ہیں:

۱۔مرحوم علامہ امینیؒ نے الغدیر، ج ۶ میں اہلسنّت کی مشہور کتب سے کثیر تعداد میں ماخذ اور مصادر (جیسے سنن دارمی، تاریخ ابن عساکر، تفسیر ابن کثیر، الاتقان جو جلال الدین سیوطی کی تصنیف ہے، نیز ان کی تفسیر دُرّالمنثور، فتح الباری اور دیگر کتب) سے دل ہلا دینے والے واقعات بیان کیے ہیں۔

ایک واقعہ ''صبیغ عراقی'' کے بارے میں نقل کیا گیا ہے۔کتب تاریخ سے یہ بات واضح ہے:

''صبیغ'' ایک صاحبِ جستجو اور تحقیق میں دلچسپی رکھنے والا انسان تھا، نیز ہمیشہ قرآن کی آیات کے بارے میں سوالات پوچھتا تھا،لیکن خلیفۂ دوّم نے اس کے سوالات کرنے پر اتنی شدّت سے غصّہ کیا جو آج ہمارے لیے نہایت تعجب کا باعث ہے۔اس کے علاوہ ایک اور واقعے میں ہے کہ کوئی ''خلیفۂ دوّم'' کے پاس آیا اور ان سے کہا، ہم ایک شخص کو جانتے ہیں جو قرآن کے مشکل مقامات کی تاویل کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

خلیفۂ دوّم نے کہا، خداوندا مجھے اتنی قدرت دے کہ میرا ہاتھ اس تک پہنچ سکے۔ایک دن خلیفۂ دوّم بیٹھے تھے، ایک شخص آیا جو سر پر عمامہ رکھے ہوئے تھا، اُس نے خلیفۂ دوّم کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا، یاامیرالمومنین! "وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا" سے کیا مراد ہے؟ خلیفۂ دوّم نے کہا، یقیناً تم وہی شخص ہو جس کو میں تلاش کر رہا تھا، یہ کہہ کر خلیفۂ دوّم اپنے جگہ سے اٹھے اور اپنی دونوں آستینیں چڑھائیں اور اس کو اتنے کوڑے مارے کہ اس کا عمامہ زمین پر گر پڑا اور پھر اس سے کہا، ''خدا کی قسم اگر تمہارا سر گنجا ہوتا تو تمہاری گردن، تن سے جُدا کر دیتا'' اور پھر حکم دیا کہ اس کو ایک خاص لباس پہناؤ، اونٹ پر بٹھاؤ اور اس کے شہر لے جاؤ اور وہاں اعلان کر دو کہ ''صبیغ'' علم کی جستجو میں نکلا تھا اور اس سے غلطی سرزد ہوئی ہے، تاکہ سب اس سے گریز کریں۔اس واقعے کے بعد وہ اپنی قوم میں ایک حقیر شخص ہو کر رہ گیا تھا، یہاں تک کہ اس دنیا سے

رخصت ہو گیا۔ جبکہ اس واقعے سے پہلے وہ اپنی قوم کا بڑا بزرگ اور سرپرست شمار ہوتا تھا۔''[۱]

ایک دوسری حدیث میں ''نافع'' سے نقل ہوا ہے کہ ''صبیغ'' ہمیشہ قرآن کے بارے میں سوالات کیا کرتا تھا، جب وہ مصر پہنچا تو عمرو بن عاص نے اس کو خلیفۂ دوّم کے پاس بھیجا، خلیفۂ دوّم نے ایک حکم دیا۔ درخت سے تازہ شاخیں توڑ کر لائی گئیں۔ ''صبیغ'' کو خلیفۂ دوّم نے ان شاخوں سے اتنا پیٹا کہ اس کی پشت زخمی ہو گئی اور پھر اُس کو رہا کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب زخم ٹھیک ہو گیا، دوبارہ اُس کو پچھلی مرتبہ کی طرح مارا پیٹا، پھر اُس کو چھوڑ دیا۔ جب وہ صحت یاب ہو گیا تو پھر تیسری بار اپنے آدمی کو اس کے پاس بھیجا تا کہ وہی عمل پھر دوہرایا جائے۔ ''صبیغ'' نے خلیفۂ دوّم سے کہا، اگر مجھے قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہو تو مناسب طریقے سے قتل کر دو، کم از کم اذیّت دے کر میری جان مت لو، اور اگر میرا علاج کرنا چاہتے ہو تو اب میں خدا کی قسم ٹھیک ہو چکا ہوں۔ خلیفۂ دوّم نے اس کو اجازت دی کہ وہ اپنے وطن واپس چلا جائے اور ابوموسیٰ اشعری کو لکھا کہ کوئی مسلمان اس کے ساتھ نہ اُٹھے بیٹھے اور نہ ہی بات چیت کرے۔ یہ معاملہ ''صبیغ'' پر بہت گراں گزرا۔ ''ابوموسیٰ'' نے خلیفۂ دوّم کو لکھا کہ وہ مکمل طور پر اپنی باتوں سے توبہ کر چکا ہے، اور اب قرآن کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرتا، اس کے بعد خلیفۂ دوّم نے اجازت دے دی کہ لوگ اس کے ساتھ رفت و آمد کر سکتے ہیں۔[۲]

ایک اور روایت میں ''صبیغ'' کی داستان کو بیان کیا گیا ہے۔ ممکن ہے خلیفۂ دوّم کے ساتھ اس کے مختلف واقعات پیش آئے ہوں، لہٰذا مختلف افراد نے مختلف انداز سے اس داستان کو تحریر کیا ہے کہ صبیغ مدینے میں داخل ہوا اور اس کی عادت تھی کہ متشابہاتِ قرآن کے بارے میں سوال کرتا تھا۔ خلیفۂ دوّم نے کسی کو اُس کے پیچھے بھیجا جب کہ وہ خود پہلے سے کھجور کے درخت کی شاخیں آمادہ کر چکے تھے۔

خلیفۂ دوّم نے اس سے پوچھا، تم کون ہو؟ اُس نے کہا، میں خدا کا بندہ صبیغ ہوں، خلیفۂ دوّم نے ان شاخوں میں سے ایک شاخ اُٹھائی اور اُس کے سر پر مارتے ہوئے کہا کہ میں خدا کا بندہ عمر ہوں، اور پھر اتنا اُس کے سر پر مارا کہ اس کا سر خون آلودہ ہو گیا، صبیغ نے کہا، اے امیر المومنین، بس کافی ہے، جو کچھ میرے دماغ میں تھا صاف ہو گیا (یعنی اب میں قرآن کے متشابہات کے بارے میں سوال نہیں کروں گا)[۳]

قابلِ توجّہ بات یہ ہے کہ ان روایات میں سے کسی میں بھی یہ نکتہ موجود نہیں کہ صبیغ نے کہیں پر بھی آیاتِ قرآنی کے

---

[۱] الغدیر، جلد ۶، ص ۲۹۱

[۲] الغدیر، جلد ۶، ص ۲۹۱

[۳] الغدیر: جلد ۶، صفحہ ۲۹۰

بارے میں اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا ہو یا کوئی طعن وتشنیع سے کام لیا ہو، بلکہ صیغ عام طور پر قرآن کے متشابہات، حروفِ قرآن اور کبھی "والذاریات ذروا" جیسی آیات کے بارے میں سوال کیا کرتا تھا، اور پھر ایسے واقعات صرف صیغ سے مخصوص نہ تھے۔ عبدالرحمٰن بن یزید نقل کرتا ہے کہ کسی شخص نے "وَفَاكِهَةً وَأَبًّا" کی آیت کے بارے میں سوال کیا، اور جب دیکھا کہ لوگ اس بارے میں گفت وشنید میں مصروف ہیں تو تازیانہ اٹھایا، ان لوگوں پر حملہ کر دیا۔ [۱]

۲- ایک اور حدیث میں ہے کہ خلیفۂ دوّم سے سوال ہوا اور "وَالْجَوَارِ الْكُنَّسِ" اِس آیت کے بارے میں پوچھا گیا کہ اس کے معنیٰ کیا ہیں؟ خلیفۂ دوّم نے اپنی چھڑی اُٹھائی اور اُس کے عمامے میں داخل کی اور عمامہ زمین پر گرا دیا اور اس سے کہا، کیا تم ''حروری'' ہو؟ حروری اُس زمانے میں ان لوگوں کو کہا جاتا تھا جو اسلام سے خارج ہو چکے تھے اور پھر کہا، ''اُس کی قسم، جس کے ہاتھ میں عمر کی جان ہے، اگر میں تمہارا سر گنجا نہ پاتا تو اتنا تمہیں پیٹتا کہ یہ سوچ تمہارے دماغ سے صاف ہو جاتی۔ [۲] عین ممکن ہے کہ سر منڈوانا، اُن خوارج کے گروہ کا شعار رہا ہو جس کی تاریخ حضرت امیر المومنینؑ کے زمانے سے بھی پہلے ہے۔ یوں سمجھ لیں اُن کا وجود ظہورِ اسلام کے ساتھ ساتھ ہے۔ [۳]

سوال یہ ہے کہ جو کوئی قرآن کے بارے میں سوال کرے تو کوئی بھی جواب دیے بغیر لاٹھی یا کوڑے سے اُسے سزا دینی چاہیے؟ فرض کر لیتے ہیں کہ بعض بے دین اور منافق افراد مسلمانوں کے اذہان کو پریشان کرنے کے لیے نامعقول قسم کے سوالات کیا کرتے تھے تو خلیفۂ مسلمین کا فریضہ اس کے بارے میں کیا یہ ہونا چاہیے تھا کہ کوڑے اور لاٹھی سے اس کا جواب دیا جائے یا کہ پہلے علمی اور منطقی اعتبار سے اس کی توضیح کی جائے اور اگر وہ پھر بھی تسلیم نہ کریں تو انہیں تنبیہہ کی جائے۔ یا یہ طرزِ عمل کس وجہ سے تھا اور وہ سخت غصے اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو جاتے تھے یا کوئی دوسری وجہ اور دلیل ان کے پاس تھی جس کی بنا پر وہ ہر ایسے شخص کو مشکوک سمجھ کر اسے نشانہ غیظ بنا دیتے تھے یہاں تک کہ اس کا عمامہ بھی سر سے اتار کر زمین پر پھینک دیتے تھے۔

۳- شرحِ نہج البلاغہ میں ابن ابی الحدید نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"دَرَّةُ عُمَرَ اَهْيَبُ مِنْ سَيْفِ الْحَجَّاجِ"

''حضرت عمر کا تازیانہ (کوڑا) حجاج کی تلوار سے زیادہ ہیبت ناک تھا۔''

---

[۱] الدرّ المنثور: جلد ۶، صفحہ ۳۱۷

[۲] الدرّ المنثور: جلد ۶، صفحہ ۳۲۳

[۳] کنز العمال جلد ۱۱، ص ۳۲۲، حدیث، ۳۱۶۲۷، ملل ونحل شہرستانی، جلد ۱، ص ۱۱۴

اور پھر کہتے ہیں حدیث صحیح میں یہ بات موجود ہے:

''رسول خداؐ کے پاس کچھ خواتین آئیں اور انھوں نے اچھا خاصا شور وغل مچایا ہوا تھا، خلیفۂ دوّم آئے تو سب ان سے ڈر کر بھاگ گئیں، خلیفۂ دوّم نے ان خواتین سے کہا، اے اپنی جانوں کی دشمن، مجھ سے تو ڈرتی ہو اور خدا کے رسولؐ سے نہیں ڈرتیں! تو انھوں نے کہا ہاں، ہاں "اَنْتَ اَغْلَظُ وَ اَفَظُّ" ''تم سخت مزاج اور سخت زبان ہو''۔''[۱]

۴۔اسی کتاب میں یہ بھی نقل ہوا ہے:

''خلیفۂ دوّم نے سب سے پہلے جسے تازیانہ مارا ہے، وہ ''اُمّ فروہ'' خلیفہؓ کی بہن ہے، جب خلیفہ کا انتقال ہوا تو خواتین نے گریہ وزاری کی، خلیفہ کی بہن بھی ان کے درمیان تھی، خلیفۂ دوّم نے بار بار ان کو منع کیا لیکن وہ روتی رہیں، خلیفۂ دوّم نے اُمّ فروہ کو ان خواتین سے علیحدہ کیا اور تازیانے سے مارا، تمام خواتین ڈر کر وہاں سے منتشر ہو گئیں۔''[۲]

۲۔عذر خواہیاں

۱۔اہلِ سنّت کی کتب حدیث میں سے ایک جامع کتاب سنن بیہقی میں شعبی سے ایک روایت نقل ہوئی ہے:

ایک دن خلیفۂ دوّم نے خطبہ دیا، حمد اور خدا کی ستائش کے بعد کہا، آگاہ رہنا خواتین کا مہر زیادہ نہ رکھنا، ورنہ اگر مجھے پتا چلا کہ کسی نے رسولؐ سے زیادہ (اپنی ازواج کا مہر) مقدار مہر معین کی ہے تو اضافی مقدار کو میں بیت المال میں شمار کروں گا، یعنی ضبط کر لوں گا اور پھر منبر سے نیچے آ گئے، قریش کی ایک عورت خلیفہ کے پاس آئی اور کہا، ''اے خلیفۂ دوّم، کیا کتابِ الٰہی (قرآن) کی پیروی زیادہ ضروری ہے یا آپ کی بات کی؟''

خلیفۂ دوّم نے کہا، اللہ تعالیٰ کی کتاب کی، لیکن تمہارا مقصد کیا ہے؟ اُس عورت نے کہا، اے خلیفہ تم نے ابھی عورتوں کی مہر کی رقم بڑھانے سے منع کیا ہے، جبکہ خدا فرما رہا ہے:

"وَ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْـًٔا"

''اگر تم نے (بطور مہر) مالِ کثیر اپنی ازواج میں سے کسی ایک کو دے دیا تھا تو اس میں سے رتی برابر بھی کوئی چیز واپس نہیں لینا۔''[۳]

حضرت عمر نے کہا: "کُلُّ اَحَدٍ اَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ"

---

[۱] نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج ۱، ص ۱۸۱

[۲] نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج ۱، ص ۱۸۱

[۳] سورۂ نساء: آیت ۲۰

''ہر کوئی عمر سے زیادہ فقیہ ہے۔''

انھوں نے اس جملے کو دو تین مرتبہ تکرار کیا، منبر پر دوبارہ گئے اور کہا، اے لوگو! میں نے تم لوگوں کو اپنی ازواج کے مہر کی مقدار بڑھانے سے منع کیا تھا، لیکن آگاہ رہنا کہ تم سب آزاد ہو، جیسے چاہو اپنے مال میں سے خرچ کرو، یعنی مہر کم یا زیادہ مقرر کرو۔''[1]

یہ حدیث اور کئی کتب میں مختصر سی تبدیلی کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔[2]

۲۔ ذخائر العقبیٰ، مطالب السیؤول اور مناقبِ خوارزمی اور ان جیسے سیکڑوں مشہور و معروف مصادر اور ماخذ میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے:

ایک حاملہ عورت نے زنا کرنے کا اعتراف کیا تھا، اُسے خلیفۂ دوّم کے پاس لایا گیا، خلیفہ نے اُسے رجم (سنگسار) کرنے کا حکم دیا، راستے میں حضرت علیؑ سے سامنا ہو گیا، آپؑ نے فرمایا: اس عورت کا کیا ماجرا ہے؟ بتانے والوں نے کہا کہ خلیفۂ دوّم نے رجم کرنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت علیؑ نے اُس عورت کو واپس کر دیا اور خلیفۂ دوّم سے کہا:

''هٰذَا سُلطَانُكَ عَلَيْهَا فَمَا سُلْطَانُكَ عَلٰى مَا فِيْ بَطْنِهَا''

تم کو اس عورت پر اختیار ہے (یعنی دلائل کی روشنی میں اُس کو سزا دی جا سکتی ہے) لیکن تمہارے پاس اُس بچے کے بارے میں کیا دلیل ہے، جو شکمِ مادر میں ہے؟ پھر مزید اضافہ کرتے ہوئے فرمایا، شاید تم اس عورت پر چیخے ہو گے یا اُس کو ڈرایا دھمکایا ہو گا (تاکہ گناہ کا اعتراف کرے) خلیفۂ دوّم نے کہا، جی! ایسا ہی ہے، تو امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہما السلام نے فرمایا: ''کیا تم نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہیں سنا کہ آپؐ نے فرمایا، جو کوئی قید اور زنجیر یا دھمکانے سے اعتراف کر لے تو اس کے اعتراف کا کوئی اثر نہیں (یعنی جرم ثابت نہیں ہو گا) خلیفۂ دوّم نے اُس عورت کو آزاد کرتے ہوئے کہا:

''عَجَزَتِ النِّسَاءُ اَنْ تَلِدْنَ مِثْلَ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ، لَوْلَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ''

''دنیا کی مائیں علی ابن ابی طالب علیہما السلام جیسے کو جنم دینے سے عاجز ہیں (سچ تو یہ ہے کہ) اگر حضرت علیؑ نہ

---

[1] سنن بیہقی: ج ۷، ص ۲۳۳

[2] جن مصنفین نے اس حدیث کو اپنی کتب میں بیان کیا ہے، اُن میں سے چند درج ذیل ہیں، سیوطی نے ''الدر المنثور'' میں، زمخشری نے ''کشاف'' میں، صاحب کنز العمال نے جلد ۸، ص ۲۹۸ پر اور ابن ابی الحدید نے اپنی شرح نہج البلاغہ جلد ۱، ص ۱۸۲ پر، مذکورہ بالا آیت کے ضمن میں اس حدیث کا تذکرہ کیا ہے۔

ہوتے تو عمر (اب تک) ہلاک ہو چکا ہوتا۔''[۱]

۳۔صحاح ستّہ، اہلسنّت کی چھے اہم کتب احادیث کا مجموعہ ہے، جس کی سند کو علمائے اہلسنّت نے معتبر مانا ہے، صحیح ابی داؤد ان کتب میں سے ایک ہے۔ اسی کتاب میں ابن عباسؓ سے نقل ہے:

''ایک دیوانی عورت کو خلیفۂ دوّم کے پاس لایا گیا، وہ عورت زنا کی مرتکب ہوئی تھی، خلیفۂ دوّم نے اس عورت کے بارے میں لوگوں کے ایک گروہ سے مشورہ کیا اور آخر کار اُسے ''سنگسار'' کرنے کا حکم دے دیا، حضرت علیؑ کا وہاں سے گزر ہوا، آپؑ نے اُس عورت کے بارے میں دریافت کیا، لوگوں نے پورا ماجرا بیان کیا، امام حضرت علیؑ نے اس عورت کو واپس بھیج دیا اور خود خلیفۂ دوّم کے پاس پہنچ گئے، آپؑ نے فرمایا: ''اے عمر، تمہیں نہیں پتا کہ تین گروہ ایسے ہیں، جن سے ذمے داری اُٹھالی گئی ہے، دیوانے پر سے جب تک کہ وہ صحت یاب نہ ہو جائے، سوتے ہوئے انسان پر سے جب تک کہ وہ جاگ نہ جائے اور بچے پر سے جب تک کہ وہ عاقل (سمجھدار) اور بالغ نہ ہو جائے، خلیفۂ دوّم نے کہا، ہاں جانتا ہوں، آپؑ نے فرمایا ''پھر اس دیوانی عورت کو سنگسار کرنے کا حکم کیوں دیا؟'' خلیفۂ دوّم نے جواب کچھ نہیں دیا اور اس عورت کو آزاد کر دیا، نیز تکبیر کہنی شروع کر دی (تکبیر کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اپنی غلطی پر قابو پالیا)۔''[۲]

''مناوی'' نے فیض الغدیر نامی کتاب میں اس حدیث کو احمد بن حنبل سے نقل کیا ہے اور اس کے ضمن میں یہ جملہ بھی آیا ہے کہ خلیفۂ دوّم نے کہا:

''لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ''[۳]

مذکورہ بالا موضوع کے بارے میں، اب تک جو کچھ بیان ہوا وہ ایک سرسری سا جائزہ ہے اور اگر اس موضوع سے متعلق تمام مسائل کو مدنظر رکھا جائے تو یہ ایک مستقل کتاب بن جائے گی۔ علّامہ امینی مرحوم نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اور ایک سو مقامات کی نشاندہی کی ہے اور اپنی کتاب ''الغدیر'' میں اس فصل کا نام ''نَوَادِرُ الْآثَرِ فِیْ عِلْمِ عُمَرَ'' رکھا ہے۔[۴] دراصل یہ وہی موضوع ہے جس کا تذکرہ مذکورہ بالا خطبے میں ''کثرت کے ساتھ غلطیاں اور ان کی معافیاں'' کے ضمن میں کیا گیا ہے۔

---

[۱] ذخائر العقبیٰ، ص ۸۰، مطالب السئول، ص ۱۳، مناقب خوارزمی، ص ۴۸، اربعین فخر رازی، ص ۶۶ ۴، الغدیر کے مطابق ج ۶، ص ۱۱۰

[۲] صحیح ابی داؤد: ج ۴، ص ۱۴۰ (کتاب حدود: حدیث ۴۳۹۹)

[۳] کتاب السبعۃ من السلف من الصحاح الستۃ مولف فیروز آبادی: صفحہ ۹۵۔

[۴] الغدیر: جلد ۶، ص ۸۳ تا ۳۲۴

۳۔ ایک سوال اور اُس کا جواب

حضرت امام علی ابن ابی طالب علیہما السلام نے اس خطبے میں خلیفۂ ثانی کے زمانے کی مشکلات اور مسائل کا جو نقشہ کھینچا ہے، عین ممکن ہے یہ نقشہ بعض افراد کی ذہنیت سے مختلف ہو، جو یہ سمجھتے ہیں کہ (تاریخ کی منقولہ کتابوں کے مطابق) خلیفۂ دوّم کا زمانہ بہت کامیاب اور درخشاں دور تھا، لہٰذا تاریخ کے آئینے میں اگر یہ موازنہ کیا جائے گا تو اذہان میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ یہ بات کیسے صحیح ہوسکتی ہے؟

اس سوال کا جواب با آسانی سمجھا جا سکتا ہے اگر ایک نکتے پر توجہ کی جائے (جیسا کہ پہلے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے) اور وہ نکتہ یہ ہے کہ بے شک خلیفۂ دوّم کے زمانے میں خارجی پالیسی (خارجہ سیاست) یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ (قرآنی تصوّرِ جہاد کی بنیاد پر) ممالک اور ریاستوں کو فتح کیا جائے، لہٰذا ہر سال اور ہر ماہ اسلامی مملکت کی حدود میں اضافہ ہوتا گیا اور یہ وہ چیز تھی جس نے با آسانی لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ عالم اسلام کے اندر کے حالات، مسائل، مشکلات نیز بڑھتے ہوئے انحرافات کی طرف سے غفلت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا، اُدھر مالِ غنیمت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یقینی طور پر ایک ذمّے دار سربراہ، رہبر اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین (حضرت علی علیہ السلام) کے لیے یہ سب سے بڑا درد تھا کہ اگر ایک حکومت کی حدود (ذمے داریاں) اُس کی انتظامی صلاحیت اور طاقت سے زیادہ بڑھ جائیں اور آہستہ آہستہ اس حکومت کی بنیادیں کمزور ہوتی جائیں تو آج نہیں تو کل اس حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا، آج بھی ''سیاست اور حکومت کی دنیا میں'' ایسے ہی طریقۂ کار کو آزمایا جاتا ہے کہ حکومت اور ملک کے داخلی نیز بنیادی مسائل پر پردہ ڈالنے اور رائے عامّہ کو راضی رکھنے کے لیے خارجہ پالیسی کے ذریعے دیکھنے والوں، سوچنے والوں اور انگلی اُٹھانے والوں کی توجہ کسی اور جانب کر دی جاتی ہے اور یوں با آسانی عوام الناس کے ذہن کو اپنے مفادات کے مطابق تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ امام علیہ السلام نے سختی سے ان بڑھتی ہوئی مشکلات اور اشتباہات کا ذکر کیا ہے، جو خلیفۂ دوّم کے دور میں پیدا ہو رہے تھے۔ ان کا حساب فتوحات کے مسئلے سے بالکل جدا تھا۔

تیسرا حصّہ

حَتّٰی اِذَا مَضٰی لِسَبِیْلِہٖ جَعَلَھَا فِیْ جَمَاعَۃٍ زَعَمَ اَنِّیْ اَحَدُھُمْ فَیَا لِلّٰہِ وَ لِلشُّوْرٰی مَتَی اعْتَرَضَ الرَّیْبُ فِیَّ مَعَ الْاَوَّلِ مِنْھُمْ حَتّٰی صِرْتُ اُقْرَنُ اِلٰی ھٰذِہِ النَّظَائِرِ لٰکِنِّیْ اَسْفَفْتُ اِذْ اَسَفُّوْا وَ طِرْتُ اِذْ طَارُوْا فَصَغَا رَجُلٌ مِنْھُمْ لِضِغْنِہٖ وَ مَالَ الْاٰخَرُ لِصِھْرِہٖ مَعَ ھَنٍ وَ ھَنٍ اِلٰی اَنْ قَامَ ثَالِثُ الْقَوْمِ نَافِجاً

حِضْنَيْهِ بَيْنَ نَثِيلِهِ وَ مُعْتَلَفِهِ وَ قَامَ مَعَهُ بَنُو اَبِيهِ يَخْضَمُونَ مَالَ اللهِ خِضْمَةَ الْاِبِلِ نِبْتَةَ الرَّبِيعِ اِلٰى اَنِ انْتَكَثَ عَلَيْهِ فَتْلُهُ وَ اَجْهَزَ عَلَيْهِ عَمَلُهُ وَ كَبَتْ بِهِ بِطْنَتُهُ

''یہاں تک کہ وہ بھی اپنے راستے پر چلا گیا، لیکن خلافت کو ایک جماعت میں قرار دے گیا جن میں ایک مجھے بھی شمار کیا گیا۔ خدا کی پناہ کہ میرا اس شوریٰ سے کیا تعلق تھا؟ ان کے پہلے شخص کے مقابلے میں مجھ میں پہلے دن کون سا عیب و ریب تھا کہ آج مجھے ایسے لوگوں کے ساتھ ملایا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے انہیں کی فضا میں پرواز کی اور یہ نزدیک فضا میں اُڑے تو وہاں بھی ساتھ رہا اور اونچے اُڑے تو وہاں بھی ساتھ رہا، مگر پھر بھی ایک شخص اپنے کینے کی بنا پر مجھ سے منحرف ہو گیا اور دوسرا دامادی کی طرف جھک گیا اور کچھ اور بھی ناقابلِ ذکر اسباب و اشخاص تھے، جن کے نتیجے میں تیسرا شخص سرگین اور چارے کے درمیان پیٹ پھُلائے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ اس کے اہل خاندان بھی کھڑے ہوئے جو مال خدا کو اس طرح ہضم کر رہے تھے جس طرح اونٹ بہار کی گھاس کو چر لیتا ہے، یہاں تک کہ اس کی بٹی ہوئی رسی کے بل کھل گئے اور اس کے اعمال نے اس کا خاتمہ کر دیا اور شکم پُری نے منہ کے بل گرا دیا۔''

شرح و تفسیر

خلیفۂ سوّم کا دورِ حکومت

خطبے کے اس حصے میں امام نے خلیفۂ دوّم کے دورِ خلافت ختم ہونے اور خلیفۂ سوّم کے خلافت پر پہنچنے کے اسباب کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس واقعے کے دقیق اور باریک تاریخی نکات، پوشیدہ اسرار یا نیم پوشیدہ اسرار سے پردہ اُٹھایا ہے۔ اس حوالے سے اپنے موقف کو کھل کر بیان کیا ہے، نیز اس تسلسل میں امت اسلامی کو خلیفہ سوم کے دور میں انتہائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور شور و غل بلند ہوا، جس کے نتیجے میں خلیفہ قتل ہوا۔ ان تمام حقائق کو مختصر، جامع اور کنایات و استعارات نیز تشبیہات کے ساتھ بیان کیا ہے۔

پہلے آپ فرماتے ہیں:

''حَتّٰى اِذَا مَضٰى لِسَبِيلِهِ جَعَلَهَا فِي جَمَاعَةٍ زَعَمَ اَنِّي اَحَدُهُمْ فَيَالَلّٰهِ وَلِلشُّوْرٰى''

''یہاں تک کہ وہ بھی اپنے راستے پر چلا گیا لیکن خلافت کو ایک جماعت میں قرار دے گیا جن میں ایک مجھے بھی شمار کیا گیا۔''

میں بھی انہی میں سے ایک تھا، اس سے ممکن ہے یہ ان دو معانی کی طرف اشارہ ہو پہلا ظاہری طور پر مجھے بھی خلافت کا حصہ دار قرار دیا جبکہ وہ جانتے تھے گہرائی میں اس کا نتیجہ کیا ہے۔ کون شخص اس شوریٰ سے باہر نکل سکتا ہے۔ دوسری بات یہ تھی اُنہوں نے ظاہری طور پر یہ اظہار کیا کہ میں بھی اُن پانچ افراد کے ہمراہ ہوں جبکہ وہ اندرونی طور پر جانتے تھے کہ میرا موازنہ اُن میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی نہیں ہے۔ [۱]

یہ جملہ اُس زمانے کی طرف اشارہ ہے، جب فیروز نے جس کی کنیت ابولولو تھی، خلیفۂ دوّم کو زخمی کر دیا۔ جب خلیفۂ دوّم نے شدید زخمی ہونے کے بعد خود کو موت کے بستر پر پایا۔ اُس وقت بعض اصحاب آ کر کہنے لگے، آپ اپنے بعد کسی کو خلافت کے لیے جانشین منتخب کریں۔ انھوں نے چھے افراد پر مشتمل شوریٰ قرار دی، جس کو ہم بعد میں تفصیل سے بیان کریں گے۔ امام علیؑ، حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد ابن ابی وقاص۔ ان افراد کو چاہیے کہ وہ تین دن کے اندر خود میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کریں، ابوطلحہ انصاری کو حکم دیا کہ وہ انصار میں سے پچاس افراد کو ان کے ہمراہ اپنے گھر دعوت دیں تا کہ ایک دوسرے سے مشورہ کر سکیں۔ بالآخر باہمی روابط کی بنا پر انھوں نے خلیفہ سوم کو منتخب کیا۔ امام علیہ السلام اس حوالے سے فرماتے ہیں، اس شوریٰ سے میں خدا کی پناہ چاہتا ہوں۔ [۲]

شوریٰ کی کمزوری کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"مَتیٰ اعْتَرَضَ الرَّیْبُ فِیَّ مَعَ الْاَوَّلِ مِنْھُمْ، حَتّیٰ صِرْتُ اُقْرَنُ اِلیٰ ھٰذِہِ النَّظَائِرِ"

''خدا کی پناہ کہ میرا اس شوریٰ سے کیا تعلق تھا؟ ان کے پہلے شخص (خلیفۂ اوّل) کے مقابلے میں مجھ میں پہلے دن کون سا عیب و ریب تھا کہ آج مجھے ایسے لوگوں کے ساتھ ملایا جا رہا ہے۔

یہ جملہ مولاؑ کی انتہائی افسوسناک حالت کو آشکار کرتا ہے، جن کے حق کو پامال کیا گیا اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اگر وہ لوگ چاہتے کہ خلافت کے حقدار کو مدنظر رکھا جائے تو بغیر کسی تردّد کے میرا تعین کرتے، لیکن انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ان کے دیگر اہداف بھی تھے۔ یقیناً یہ افسوس کا مقام ہے وہ جو نفسِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہو، علومِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دروازہ ہو، کتاب وسنّت کا عالم ہو اور اسلام کے تمام مسائل سے آگاہ ہو، جس کی زندگی کا آغاز مکتب توحید سے ہوا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قربت میں پرورش پائی ہو، اُس کو عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن وقاص کے برابر قرار دیا جائے۔

آگے مزید فرمایا:

---

[۱] مقائیس اللغۃ میں ہے زعم کے اصل معنی یہ ہیں کہ وہ گفتگو جس کی کوئی حقیقت نہ ہو اور گفتگو کرنے والا خود مطمئن نہ ہو۔

[۲] للّٰہ، کا لام مفتوح ہے اور استغاثہ کے لیے آتا ہے اور لام للشوریٰ میں مکسور ہے مستغاث منہ ہے۔

"لٰكِنِّيْٓ اَسْفَفْتُ اِذْ اَسَفُّوْا، وَطِرْتُ اِذْ طَارُوْا" [۱]

''لیکن میں نے اسلام کی مصلحتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اُن کے ساتھ تعاون کیا۔ جب نیچے آنا پڑا تو نیچے آیا اور کبھی پرواز کرنے لگے تو میں نے بھی پرواز کی۔''

یہ کنایہ ہے اُن پرندوں کی حالت کے بارے میں جو اجتماعی طور پر پرواز کرتے ہیں، کبھی اوپر کی طرف اور کبھی نیچے کی طرف پرواز کرتے ہیں اور زمین کے قریب ہوجاتے ہیں۔ دونوں حالتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ خلفا کے دور کے حالات بالخصوص جب وہ ایک دور سے نکلتے تھے تو اُس وقت حالات کا تقاضا تھا کہ ہر قسم کے فتنہ و فساد سے اجتناب کریں، کہیں ایسا نہ ہو جو دشمن کمیں گاہوں میں بیٹھے ہیں، وہ سر اُٹھاتے ہوئے اسلام کی جڑوں کو نقصان پہنچائیں۔ اس جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ امامؑ کا مقصد یہ تھا، میں ہمیشہ سے حق کی جستجو میں ہوں اور حصولِ حق کے لیے سعی و تلاش کر رہا ہوں۔ وہ لوگ جو آگے آگے تھے اُن کے ہمراہ بھی تھا اور پیچھے پیچھے چلنے والوں کے ساتھ بھی تھا۔

پھر شوریٰ کے نتیجے اور اُس میں انجام پانے والے قبیح فعل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"فَصَغَا [۲] رَجُلٌ مِنْهُمْ لِضِغْنِهٖ [۳] وَمَالَ الْاٰخَرُ لِصِهْرِهٖ مَعَ هَنٍ [۴] وَهَنٍ"

''اُس شوریٰ کے اراکین میں سے ایک نے مجھ سے عداوت کی بنا پر روگردانی کی، دوسرے نے رشتے داری کو حقیقت پر مقدم سمجھا اور اپنے داماد (حضرت عثمان) کی طرف رُخ کر لیا، اس کے علاوہ اور بھی اسباب تھے، جن کا ذکر کرنا مناسب نہیں۔''

مولا علی علیہ السلام کا مقصد پہلے جملے میں سعد ابن ابی وقاص تھا۔ اُن کی ماں کا تعلق بنی اُمیہ میں سے تھا۔ اُن کے ماموں اور دیگر رشتے دار کفر و اسلام کے درمیان ہونے والی جنگوں میں امام علیؑ کے ہاتھوں قتل ہوئے، اسی بنا پر اُس نے امام علیؑ کے دورِ حکومت میں بھی بیعت نہیں کی (عمر ابن سعد جو واقعۂ عاشورا میں لشکر یزید کا سپہ سالار تھا وہ اسی کا بیٹا ہے) اُس کی دشمنی امام علی علیہ السلام سے مسلّم تھی، اسی لیے اُس نے شوریٰ میں امام علی علیہ السلام کی حمایت نہیں کی۔ اور عبدالرحمٰن بن عوف کے وسیلے سے خلیفہ

---

[۱] اسففت مادّہ اسفاف سے مشتق ہے کسی چیز کی قربت حاصل کرنے کے معنی میں ہے، جب پرندہ خود کو زمین کے قریب تر کر دیتا ہے، تو یہ تعبیر استعمال ہوتی ہے۔ یہ تعبیر چٹائی وغیرہ کو بنانے کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے ریشے ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں، شدت کیساتھ نگاہ کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

[۲] صغا، کا مادّہ صغو ہے بروزن فعل معنی کسی چیز کی طرف مائل ہونے کے ہیں۔

[۳] ضغن، بروزن ضمن، عداوت و کینہ کے معنی میں آیا ہے۔

[۴] ھن، کی شرح آگے آئے گی۔

سوّم کی حمایت کی، بعض نے کہا ہے کہ اس شخص سے مراد طلحہ ہے، اُس کی دشمنی امامؑ سے نمایاں تھی، اس نے جنگ جمل میں زبیر کے ہمراہ مورخین کے بقول سترہ ہزار افراد کو قتل کروایا۔ اس احتمال کو ابن ابی الحدید نے تقویت دی ہے، جبکہ نہج البلاغہ کے بعض شارحین کے نزدیک طلحہ اگرچہ شوریٰ کے لیے خلیفۂ دوّم کی جانب سے منتخب ہوئے تھے لیکن وہ مدینے میں نہیں تھے اور وہ شوریٰ کے اجلاس میں شرکت نہ کر سکے۔ شرح نہج البلاغہ خوئی میں شوریٰ میں طلحہ کی غیر موجودگی کو طبری سے نقل کیا ہے۔[۱] جس شخص کو دامادی کی وجہ سے انتخاب کیا، وہ عبدالرحمٰن بن عوف تھے جو خلیفۂ سوّم کی بہن ام کلثوم کے شوہر تھے۔

لیکن یہ جملہ "مَعَ هَنٍ وَ هَنٍ"[۲] توجہ رہے کہ لفظ "هنٍ" کنایہ ہے بُری صفتوں کے لیے جن کا ذکر کرنا مناسب نہ ہو۔ ممکن ہے دیگر نامناسب اُمور کی طرف اشارہ ہو کہ عبدالرحمٰن بن عوف کو خلیفۂ سوّم کی حمایت کرتے وقت اس چیز کا انتظار تھا، مثلاً مسلمانوں کے بیت المال سے سُوئے استفادہ کرنا یا لوگوں پر حکمرانی کرنے کا خواب یا خلیفۂ سوّم کے بعد خلافت حاصل کرنا یا یہ سب کے سب، اس گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شوریٰ ایک نامعقول حالات میں وجود میں آئی۔ اُس میں جس چیز کو نظر انداز کیا گیا، وہی مسلمانوں کی مصلحت تھی، فطری بات تھی اس سے مسلمانوں کے لیے کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا، بلکہ خلیفۂ سوّم کے دور حکومت میں مسلمانوں کو سنگین نقصانات اٹھانا پڑے۔ پھر امامؑ نے اس شوریٰ کے نتیجے کے حوالے سے فرمایا:

"اِلٰی اَنْ قَامَ ثَالِثُ الْقَوْمِ نَافِجًا[۳] حِضْنَيْهِ[۴] بَيْنَ نَثِيْلِهٖ[۵] وَ مُعْتَلَفِهٖ"[۶]

"(یہ صورت حال اسی طرح برقرار رہی) یہاں تک کہ ان میں سے تیسرا بھی اپنی راہ پر روانہ ہو گیا، جبکہ اس کے شکم کے دونوں پہلو زیادہ کھانے سے باہر آ گئے تھے اور اسے سوائے بیت المال کے خورد برد اور اسے ناجائز طریقے سے جمع کرنے کے علاوہ کوئی اور فکر نہیں تھی۔" اس وادی میں چلنے والوں میں وہ تنہا نہیں تھا، بلکہ

---

[۱] شرح نہج البلاغہ خوئی کے مطابق طلحہ شوریٰ میں نہیں تھا بلکہ وہ مدینے میں بھی اس دن نہ تھا۔ انہوں نے طبری سے نقل کیا ہے، (شرح خوئی، جلد ۳، ص ۷۳)

[۲] علمائے لغت نے تصریح کی ہے کہ "ھن" بمعنی فلاں ہے اُس وقت بولا جاتا ہے جب انسان اجمالاً کسی چیز کی طرف اشارہ کرے۔ اُس کی بدی کی وجہ سے یا دوسرے دلائل کی بنا پر عمومی طور پر یہ صفت بدی، نامانوس چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نیک چیزوں کے لیے استعمال نہیں ہوتا ہے۔

[۳] نافجا، مادّہ نفج سے مشتق ہے بروزن رفع اوپر آنے کے معنی میں ہے۔

[۴] حضن، پہلو کے معنی میں ہے، نافجا حضنیہ، اُس شخص کو کہا جاتا ہے جس کا پہلو تکبر یا بسیار خوری کی وجہ سے پھول گیا ہو۔

[۵] نثیل مادّہ نثل سے مشتق ہے بروزنِ نسل ایک چیز کا دوسری چیز سے نکلنے کے معنی میں ہے انسان اور جانور کے فضلہ (پاخانہ) کو بھی کہا جاتا ہے۔

[۶] معتلف، علف کے مادّے سے مشتق ہے، گھاس رکھنے کی جگہ کو کہا جاتا ہے۔

"وَ قَامَ مَعَهُ بَنُوْ اَبِيْهِ يَخْضِمُوْنَ[1] مَالَ اللّٰهِ خِضْمَةَ الْاِبِلِ نِبْتَةَ الرَّبِيْعِ"

''بنی امیہ میں سے ان کے باپ کے جاننے والے اور خویش و اقارب ان کے ساتھ دینے کے لیے اس طرح کھڑے ہوئے جیسے بھوکا اونٹ گرمیوں کے موسم میں گھاس کے میدانوں میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں کی گھاس چبا چبا کر کھاتا ہے۔''

امامؑ نے تین جملوں کے ذریعے خلیفۂ سوّم کے حالات زندگی کو بیان کیا ہے۔

پہلے جملے میں فرمایا: عمومی شہرت اور لوگوں کے درمیان زہد اور قداست کی شہرت سے ہاتھ دھو بیٹھے، ان کے دوستوں اور اعوان کی دنیا پرستانہ حرکتوں نے سب کچھ مٹا ڈالا۔

دوسرے جملے میں فرمایا: اس جملے میں اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ ان کے کردار نے توقع سے پہلے اُس پر وار کر دیا اور اُس کے کام کو تمام کر دیا۔

تیسرے جملے میں فرمایا: شکم پروری نے اُن کے وزن کو سنگین کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ چل بھی نہیں سکتے تھے، اسی حالت میں زمین پر جا پڑے۔

ان تین جملوں میں تمام حکومتی عہدیداروں اور معاشرے کے ذمے داروں کے لیے ایک اہم درس عبرت ہے۔ اگر دنیا کی طرف رُخ کرتے ہوئے اپنے مقام و منصب سے سُوئے استفادہ کیا تو اُن کی سابقہ تمام نیکیاں رائیگاں چلی جائیں گی اور عمومی طور پر لوگ اُن کی مخالفت میں کمر بستہ ہو جائیں گے۔ دنیا پرستی جلدی سقوط کا باعث بنتی ہے۔ یہ نکتہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ جو چیز خلیفۂ سوّم کی خلافت کے وجود میں آنے کا سبب تھی، وہی اس کی نابودی کا سبب بنی۔ ایسے افراد مثلاً سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمٰن بن عوف اور طلحہ نے (بنابریں طلحہ بھی شوریٰ میں موجود تھے) مال و ثروت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اُن کی حمایت کی، ان کو اقتدار کی مسند پر فائز کیا اور جب یہ بات پھیلی تو عوام کی نظروں میں خلیفۂ سوّم کی مقبولیت ختم ہو گئی، جس کے نتیجے میں اُس کی خلافت کا خاتمہ ہوا۔

نہج البلاغہ کے بعض شارحین کے مطابق "اِنْتَكَثَ عَلَيْهِ فَتْلُهُ" تدابیر کو درہم برہم کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ جس نے اپنی حکومت کو تشکیل دینے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے۔ ممکن ہے اپنے قریبی رشتے داروں کو حکومتی عہدوں پر فائز کرانا اپنی حکومت کی مضبوطی کے لیے تدبیر ہو۔ لیکن اس کا نتیجہ برعکس نکلا، رشتے ختم ہو کر رہ گئے اور اپنے ہی رشتے داروں

---

[1] خضم، تمام دانتوں سے چبا کر کھانے کے معنی میں آیا ہے اور قضم، دانتوں کے سے چبا کر کھانے کو کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ خِضم سے مراد تازہ گھاس کھانے کے ہیں اور قضم سے مراد سوکھی گھاس کھانے کے ہیں۔

نے ان کے خلاف لوگوں کو ورغلایا۔

۱۔ خلیفۂ دوّم اور سوّم کے انتخاب کا طریقہ

ہم جانتے ہیں کہ خلیفۂ دوّم کے حق میں صرف ایک ہی ووٹ تھا اور وہ خلیفۂ اوّل کا تھا۔ جب انھوں نے زندگی کے آخری لمحات میں صراحت کے ساتھ اپنا جانشین منتخب کیا۔ بعض تاریخوں میں آیا ہے کہ حضرت ابوبکر نے احتضار کی حالت میں خلیفۂ سوّم کو بلایا تا کہ خلیفۂ دوّم کے حوالے سے وصیت کو تحریر کرے، اُن سے کہا لکھو:

"بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"

یہ وہ وصیّت ہے، جو ابوبکر نے مسلمانوں کے لیے کی ہے۔ اما بعد!۔۔۔ اتنا کہہ پایا تھا کہ غشی طاری ہوگئی، لیکن خلیفۂ سوّم نے اپنی رائے سے ان جملوں کو یوں لکھا:

"اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّیْ قَدِ اسْتَخْلَفْتُ عَلَيْكُمْ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَلَمْ آلُكُمْ خَيْراً"

''میں خلیفۂ دوّم کو تمہارے لیے خلیفہ مقرر کرتا ہوں میں نے کسی بھی نیک کام سے کوتاہی نہیں کی ہے۔''[1]

جب خلیفۂ سوّم نے ان کلمات کو لکھا، اُس وقت خلیفۂ اوّل کو ہوش آیا تو کہا: پڑھو! خلیفۂ سوّم نے پڑھا: خلیفۂ اوّل نے تکبیر کی آواز بلند کی اور کہا: میں سمجھتا ہوں تم نے جلدی خلیفۂ دوم کا نام لکھ دیا اور وہ تمہارے خوف کی وجہ سے تھا۔؛ اگر مجھے ہوش نہ آتا اور میں مرجاتا تو لوگ اختلافات کا شکار ہوجاتے؛ خلیفۂ سوّم نے کہا، ہاں! ایسا ہی تھا۔ خلیفۂ اوّل نے اس کے حق میں دعا کی۔[2] اس بات سے واضح ہوجاتا ہے کہ خلیفۂ سوّم نے اس لباس کو خلیفۂ دوّم کے لیے سلوایا تھا۔ اگر بالفرض خلیفۂ اوّل کو ہوش نہ آتا تو یہ وصیّت نامہ خلیفۂ اوّل کے نام سے پھیل جاتا۔ پس تعجب کی بات نہیں ہے کہ خلیفۂ دوم بھی ایسی کیفیت کے ساتھ شوریٰ تشکیل دیں کہ جس کا نتیجہ خلافت خلیفۂ سوّم کی شکل میں نمودار ہو۔ جیسا کہ خلیفۂ دوّم نے سقیفہ میں اس لباس کو خلیفۂ اوّل کے پیکر پر پہنایا اور اُس نے بھی بروقت اس کی پاداش دی۔ اس کلام سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ اگر خلیفۂ اوّل اور خلیفہ دوّم کی جانب سے جانشینی کے لیے جلدی کرنا لوگوں کو اختلاف سے بچانے کے لیے تھا، تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امت کے لیے اس قسم کی کوئی پیش گوئی نہیں کرسکتے تھے جبکہ وہ تمام چپقلش اور ناراضیاں موجود تھیں جو سقیفہ میں بھی ظاہر ہوئیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ لوگوں پر چھوڑ دیا ہو اور اس حکم سے خلیفۂ دوّم اور سوّم خارج

---

[1] آلکم مادّہ، الا، یالو، سے کوتاہی کرنے کے معنی میں ہے۔ (لسان العرب)

[2] کامل ابن اثیر جلد ۲، صفحہ ۴۲۵

ہوں؟ اور کیا خوف وفتنہ کی وجہ سے لوگوں کو شریک نہیں کیا تھا؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا ہر محقق کو جواب دینا چاہیے۔

۲۔ ابولؤلؤ کا واقعہ اور خلیفۂ سوّم کی حکومت کا آغاز

ابن اثیر نے کتاب کامل میں اس طرح نقل کیا ہے ایک دن خلیفۂ دوّم بازار میں جا رہے تھے۔ مغیرہ بن شعبہ کا غلام ابولؤلؤ جو نصرانی تھا، اُس نے ان سے ملاقات کی اور کہا، مغیرہ بن شعبہ نے ایک سنگین خراج رکھا ہے، مجھے اس نے مجبور کر دیا ہے کہ تمام دن کام کروں اور اُس میں سے خطیر رقم ان کے حوالے کروں؛ مجھے اس کے مدمقابل مددگار کی ضرورت ہے؛ خلیفۂ دوّم نے کہا، خراج کس حد تک ہے؟ کہا، ہر دن دو درہم؛ خلیفۂ دوّم نے کہا، تمہارا کام کیا ہے؟ اس نے کہا، میں ترکھان، نقاش اور لوہار ہوں؛ خلیفۂ دوّم نے کہا، اس حوالے سے تو خراج زیادہ نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم کوئی ایسی چکی تیار کر سکتے ہو، جو ہوا کے ذریعے گندم کو پیس کر آٹا بنا دے؟ فیروز عرف ابولؤلؤ نے کہا: ہاں! ایسا کر سکتا ہوں۔ خلیفۂ دوّم نے کہا: پس اس کام کو انجام دو؛ ابولؤلؤ نے کہا: اگر میں زندہ رہا تو آپ کے لیے ایک چکی تیار کر لوں گا، جس کے بارے میں مشرق ومغرب کے لوگ گفتگو کریں گے۔ ابولؤلؤ یہ کہہ کر چلا گیا۔

خلیفۂ دوّم نے کہا، اس غلام نے مجھے دھمکی دی ہے۔ چند دنوں کے بعد خلیفۂ دوّم نماز صبح کے لیے مسجد میں آئے اور چند لوگوں کو مقرر کیا کہ جب صفیں منظم ہو جائیں تو تکبیر کہیں۔ ابولؤلؤ ان لوگوں میں شامل ہو گیا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں ایسا خنجر تھا جو دو ہرا تھا (یعنی اس کا دستہ درمیان میں تھا اور پھل دونوں طرف تھا) اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خلیفۂ دوّم پر چھ وار کیے، جن میں سے ایک ان کے زیر ناف لگا اور آر پار ہو گیا، اسی زخم سے ان کا انتقال ہوا۔ اسی خنجر سے اس نے ''کلیب'' جو خلیفۂ دوّم کے پیچھے کھڑے تھے، کو قتل کیا اور کچھ دوسرے لوگوں کو قتل اور زخمی کیا۔ [1]

''مروج الذہب'' میں اس واقعے کو نقل کرنے کے بعد لکھا گیا ہے کہ ابولؤلؤ نے خلیفۂ دوّم کو قتل کرنے کے بعد مزید بارہ لوگوں کو زخمی کیا، جن میں سے چھ افراد جاں بحق ہو گئے، اس کے بعد اس نے اسی خنجر سے اپنے گلے پر وار کیا اور خودکشی کر لی۔ [2] لیکن تاریخ یعقوبی میں بتایا گیا ہے کہ خلیفۂ دوّم کے قتل کے بعد ان کے بیٹے عبداللہ نے باپ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے حملہ کر کے ابولؤلؤ، اس کی بیوی اور کمسن بیٹی، تینوں کو قتل کر دیا۔

اب رہی یہ بات کہ جو بعض مورخ لکھتے ہیں کہ ابولؤلؤ نصرانی یا مجوسی تھا اور قتل خلیفۂ دوّم کے لیے مسجد آیا تھا، کسی

---

[1] کامل ابن اثیر: جلد ۳ صفحہ ۴۹

[2] مروج الذہب: جلد ۲ صفحہ ۳۲۱

طرح قرین قیاس نہیں، کیونکہ ایک عیسائی یا مجوسی کا مسجد میں داخل ہونا بہت مشکل تھا۔ بظاہر اس خیال کی ضرورت مورخوں کو اس لیے پڑی کہ وہ خلیفہ کے ایک مسلمان کے ہاتھوں قتل ہونے پر پردہ ڈال سکیں اور اس طرح اس سے پیدا ہونے والی صورت حال سے بچ سکیں ورنہ تمام قرائن اس کی نشاندہی کرتے ہیں اور تمام مورخین نے تصریح کی ہے کہ ابولولو مسلمان تھا۔ اس کا سابقہ مجوسی یا نصرانی ہونا تنہا اس سے مخصوص نہیں، کیوں کہ غالباً خلفا اور اصحابِ رسولؐ میں بھی ایسے لوگ تھے، جو قبول اسلام سے پہلے دوسرے مذاہب کے پیروکار تھے۔

۳۔ چھے آدمیوں کی شوریٰ اور اس کا انجام

خلیفۂ دوّم نے انتقال کے وقت مشورہ کیا اور اس مشورے کو کہ عبداللہ ابن عمر (اپنے بیٹے) کو خلیفہ بنایا جائے، قبول نہیں کیا اور کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چھے آدمیوں سے راضی تھے۔ ان میں حضرت علی علیہ السلام، حضرت عثمان، طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمٰن ابن عوف تھے، اس لیے ان چھے آدمیوں کے مشورے سے خلیفہ مقرر کیا جائے، اور ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنایا جائے۔ پھر حکم دیا، ان چھے افراد کو بلایا جائے، پھر ان کی طرف دیکھا اور کہا، تم سب اس بات کے لیے تیار ہو کہ میرے بعد تم میں سے کوئی خلیفہ بنایا جائے، یہ سب خاموش رہے، پھر اس جملے کو خلیفۂ دوّم نے دہرایا؛ زبیر نے جواب دیا: ہم تم سے کم نہیں ہیں تو خلافت کو حاصل کیوں نہیں کر سکتے؟ (ایک مورّخ نے لکھا ہے کہ اگر زبیر کو خلیفۂ دوّم کی موت کا یقین نہ ہوتا تو یہ جملہ نہ کہتا) پھر خلیفۂ دوّم نے ان چھے میں ہر ایک کے بارے میں کوئی نہ کوئی عیب بیان کیا۔ طلحہ سے کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا سے گئے تو تیرے اس جملے کی وجہ سے جو تو نے آیۂ حجاب کے بارے میں کہا تھا، ناراض ہو گئے تھے۔ [۱]

حضرت علیؑ سے کہا: تم لوگوں کو سیدھے راستے پر اچھی طرح ہدایت کرتے ہو لیکن صرف تم میں عیب یہ ہے کہ بہت مذاق کرتے ہو، خلیفۂ سوّم سے کہا، میں دیکھ رہا ہوں قریش نے خلافت کو تیرے سپرد کر دیا ہے، تم بنی امیہ اور بنی ابن معیط کو اپنے اوپر حاوی کرو گے اور بیت المال ان کے حوالے کر دو گے، اور عرب کے بھیڑیے صفت کچھ افراد تمہیں بستر پر قتل کریں گے۔ آخر کار ابوطلحہ انصاری کو بلایا اور حکم دیا کہ میرے دفن کے بعد انصار کے پچاس افراد کو جمع کرنا اور ان چھے آدمیوں کو ایک گھر میں جانشین مقرر کرنے کے لیے اکٹھا کرنا۔ جب پانچ کسی ایک پر متفق ہو جائیں اور کوئی ایک ان پانچ کی

---

[۱] آیۂ حجاب سے مراد "فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ" ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کے بارے میں ہے۔ طلحہ نے کہا رسولؐ چاہتے ہیں آج اپنی بیویوں کو ہم سے چھپائیں۔ لیکن جب کل اس دنیا سے رسولؐ چلے جائیں گے تو ہم ان سے شادی کریں گے۔ لیکن یہ حضرت عمر کا کہنا طلحہ کے بارے میں خود اس میں تناقض ہے، کیونکہ پہلے کہا کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے گئے، ان چھے افراد سے راضی تھے۔

مخالفت کرے تو اس کو قتل کر دینا۔ اسی طرح چار افراد ایک فرد پر متفق ہو جائیں دو مخالفت کریں تو ان دو کو قتل کر دینا۔ اور اگر تین ایک طرف اور دوسرے تین ایک طرف ہو جائیں تو جن تین افراد میں عبدالرحمٰن بن عوف ہو ان کو ترجیح دینا اور اگر دوسرے تین افراد مخالفت کریں تو ان تینوں کو قتل کر دینا اور اگر تین دن گزر جائیں اور کسی کو یہ جانشین مقرر نہ کر پائیں تو تمام چھے افراد کو قتل کر دینا۔ اور مسلمان خود اپنے لیے خلیفہ مقرر کر لیں۔

طلحہ جانتا تھا حضرت علیؑ اور خلیفۂ سوّم کے ہوتے ہوئے خلافت تک نہیں پہنچ پائے گا، اور حضرت علیؑ سے طلحہ خوش نہیں تھا اس لیے خلیفۂ سوّم کی طرف ہو گیا، زبیر نے اپنا حق حضرت علیؑ کو دے دیا، سعد بن ابی وقاص نے اپنا حق اپنے چچازاد بھائی عبدالرحمٰن بن عوف کو دیا، اس بنا پر چھے افراد تین میں تبدیل ہو گئے۔ حضرت علیؑ، حضرت عثمان، عبدالرحمٰن بن عوف، عبدالرحمٰن حضرت علی علیہ السلام سے مخاطب ہوا اور کہا، میں تمہاری بیعت کرتا ہوں تم کتاب خدا، سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سیرت شیخین پر عمل کریں۔ حضرت علی علیہ السلام نے جواب دیا، میں قبول کرتا ہوں، لیکن میں کتاب خدا، سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے طریقے پر عمل کروں گا۔

عبدالرحمٰن نے خلیفۂ سوّم سے خطاب کیا اور اس جملے کو دہرایا، خلیفۂ سوّم نے اس کو مان لیا، عبدالرحمٰن نے اس جملے کو تین بار تکرار کیا اور وہی جواب سنا۔ لہٰذا خلیفۂ سوّم کو خلافت دے دی گئی۔ یہاں حضرت علی علیہ السلام نے عبدالرحمٰن سے فرمایا ''خدا کی قسم! تُو نے یہ کام صرف اس لیے کیا، کیونکہ تجھے وہی توقع ہے جو خلیفۂ اوّل و دوّم ایک دوسرے سے رکھتے تھے، لیکن تو ہرگز اپنی خواہش کو نہ پا سکے گا۔''[1] اس شوریٰ پر بہت سے سوالات اٹھتے ہیں:

پہلا سوال: اگر یہ انتخاب لوگوں کی آراء سے ہوا تو عام لوگوں کے درمیان کیوں نہ ہوا، اور اگر انتخاب ہوا تو چھے آدمیوں کی شوریٰ کیوں بنی، کیا اور دوسرے معزز افراد موجود نہیں تھے؟

دوسرا سوال: اگر ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راضی تھے تو خلیفۂ دوّم نے طلحہ کے بارے میں جملہ کیوں کہا تھا؟

تیسرا سوال: اگر فرض کر لیں کہ یہ چھے نفر کسی پر یکجا نہ ہوں تو ان کا قتل جائز کیسے ہوا؟

چوتھا سوال: اگر حقیقتاً شوریٰ کی اہمیت تھی تو خلیفۂ سوّم کا نام واضح طور پر خلیفہ کے لیے کیوں لیا گیا، اور خلیفۂ سوّم کو خلیفہ بنانے سے کسی قسم کا خوف تھا تو ان کو شوریٰ کا رکن نہ بنایا ہوتا، تاکہ کوئی دوسرا منتخب ہو جائے؟

پانچواں سوال: اس صورت میں جب تین ایک طرف اور تین دوسری طرف ہوں تو جس طرف حضرت علی علیہ السلام ہوں اس کو کیوں منتخب نہ کیا جائے، جبکہ خلیفۂ دوّم نے خود کہا تھا، حضرت علی علیہ السلام بہترین فرد ہیں لوگوں کی ہدایت کے لیے، لیکن

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۱، ص ۱۸۰، ۱۸۸ (تلخیص کے ساتھ)

مذاق بہت کرتے ہیں۔

چھٹا سوال: کیا مذاق کرنے سے امور خلافت میں کوئی مشکل پیش آسکتی تھی؟ اور کیا یہ اشکال اس کے برابر ہے جو خلیفۂ سوّم پر کیا کہ تو منتخب ہو کر بنی امیّہ کو لوگوں پر مسلط کرے گا اور بیت المال کو غارت کرے گا، یہ وہ اشکالات ہیں جن کا جواب نہیں ہے؟

۴۔ خلیفۂ سوّم کے خلاف تحریک کی وجوہات

نہج البلاغہ کی شرح کرنے والوں میں خلیفۂ سوّم کے متعلق صحیح ترین قول ''طبری'' کا ہے، جو لکھتے ہیں: خلیفۂ سوّم اسلام میں نئی باتیں لے کر آئے جس کی وجہ سے مسلمان غصے میں آ گئے، بالخصوص امارات کو بنی امیہ کے فاسقوں، سفی ہوں اور ان کے بے دین افراد کو سونپنا، مالِ غنیمت عطا کرنا، ابوذرؓ، عمار یاسرؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ پر ظلم وستم کرنا اور اس طرح دوسرے کام جو انہوں نے اپنی خلافت کے آخری زمانے میں انجام دیے۔

ولید بن عقبہ کو کوفے کا والی بنایا، جبکہ کچھ لوگوں نے اس کی شراب خوری پر گواہی بھی دی، ولید کے بعد سعید بن عاص کو والیِ کوفہ بنایا، سعید کا یہ عقیدہ تھا کہ عراق بنی امیہ اور قریش کا ایک باغ ہے۔ حضرت مالکِ اشترؓ نے ان کو جواب دیا: ''تُو گمان کرتا ہے کہ عراق، جس کو خدا نے ہم مسلمانوں کی تلوار کے ذریعے فتح کیا، تیرا اور تیری قوم کا حصہ ہے۔'' اس لیے اشترؓ اور قبیلہ نخع ایک طرف اور دوسری طرف پولیس کے سربراہ میں رنجشیں شروع ہو گئیں اور لوگوں کے اعتراضات سعید کے خلاف بڑھنا شروع ہو گئے۔ پھر وہ خلیفۂ سوّم کے خلاف ہو گئے۔ خلیفۂ سوّم بجائے اس کے کہ تحریک کو منطقی طریقے سے ٹھنڈا کرتے، انہوں نے تحریک کے رہبروں کو شام بھیجنا شروع کر دیا، اُس میں مالک اشترؓ اور صعصعہ بن صوحانؓ بھی شامل تھے۔

اُن کی خلافت کے گیارہویں سال کچھ اصحاب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمع ہوئے، اپنی مشکلات عامر بن عبد قیس کے ذریعے (جو عابد وزاہد انسان تھے) خلیفۂ سوّم تک پہنچائیں۔ خلیفۂ سوّم نے ایسا جواب دیا جس سے ان کی اہانت ہوئی۔ چنانچہ مدینے کی حالت بھی بحران کا شکار ہونے لگی اور اسلام کے دارالخلافے میں شورش کی لہریں موج زن ہونے لگیں۔ خلیفۂ سوّم نے امیر شام، سعید بن عاص اور دوسرے ساتھیوں کو بلایا اور مشورہ کیا، بعض نے مشورہ دیا، لوگوں کو جنگ میں مصروف کر دو، بعض نے کہا، مخالفین سے لڑو۔ بعض نے کہا، بیت المال سے عطیات دو، تاکہ غصہ اور مخالفت کم ہو جائے۔ صرف ایک آدمی نے حقیقت بیان کی کہ تم نے بنی امیہ کو لوگوں پر مسلط کیا ہے لہٰذا یا عدالت کرو یا خلافت چھوڑ دو۔ خلیفۂ سوّم نے جہاد والی

رائے کو پسند کیا اور حکم دیا لوگوں کو جہاد میں مشغول کرنے کا سامان فراہم کرو۔ (لیکن وقت گزر چکا تھا)

۳۵ھ (خلیفۂ سوّم کی حکومت کا آخری سال) خلیفۂ سوّم اور بنی امیہ کے مخالفوں میں مکاتبہ ہوا۔ خلیفۂ سوّم کو معزول کرنے کے لیے ابوحرب کی سربراہی میں مصر سے دو ہزار افراد پر مشتمل ایک گروہ زید بن صوحانؓ و مالک اشترؓ کی قیادت میں اور کوفے کے بعض بزرگ افراد اور بصرے سے تیسرا گروہ حرقوص بن زبیر کی قیادت میں خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے سفر شروع کرتے ہوئے مدینہ پہنچے اور مدینے کے لوگوں کو اپنے عزائم (خلیفۂ سوّم اور ان کے مقرر کردہ حکام کی معزولی) کے بارے میں آگاہ کیا۔ کچھ ہی دیر بعد خلیفۂ سوّم کے گھر کا محاصرہ ہو جاتا ہے اِن سے کہا جاتا ہے کہ حکومت چھوڑ دیں۔ لیکن خلیفۂ سوّم نے اپنے والیوں سے مدد چاہی، جمعہ کے روز خلیفۂ سوّم نے مسجد میں نماز پڑھی اور منبر پر آکر خطاب کیا خصوصاً ان افراد سے جو مختلف جگہوں خاص طور پر مصر سے آئے تھے، ان سے کہا، مدینے والے سب جانتے ہیں کہ تم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت کی تھی، اس جملہ پر شور شرابا شروع ہوتا ہے اور خلیفۂ سوّم خوف سے بے ہوش ہو کر منبر سے نیچے گرتے ہیں، اور لوگ انہیں اٹھا کر گھر لے جاتے ہیں۔

پھر خلیفۂ سوّم مدد حاصل کرنے کے لیے حضرت علیؑ کے گھر آئے اور کہا: آپؑ میرے چچازاد ہیں، رشتے داری کی وجہ سے آپؑ پر میرا حق ہے، آپؑ کی قدر و منزلت لوگوں کے درمیان قائم ہے اور لوگ آپؑ کی بات بھی مانتے ہیں، آپؑ لوگوں سے کہیں، جس راستے کو چنا ہے، اسے چھوڑ دیں، امامؑ نے فرمایا: کس طرح ان کو راستہ چھوڑنے پر تیار کروں، خلیفۂ سوّم نے کہا، آپؑ لوگوں سے کہیں کہ آج کے بعد خلیفۂ سوّم میرے مشورے پر عمل کریں گے، امامؑ نے فرمایا: میں نے تم سے کتنی بار ایسا کرنے کو کہا، تم نے وعدہ کیا لیکن اس پر عمل نہیں کیا۔

بہر حال امامؑ اس فتنے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے تیس ایسے افراد کو جو انصار و مہاجرین میں سے تھے جن کا تعلق مصر سے تھا اور وہ خلیفۂ سوّم کی معزولی کی کوششوں میں دوسروں سے زیادہ فعال تھے، حضرت علیؑ کے کہنے پر وہ مصر چلے جاتے کہ خلیفۂ سوّم شکایات دور کرنے کا وعدہ کر رہے ہیں اور سابقہ حکام کو معزول کر دیں گے، لیکن جب خلیفۂ سوّم گھر آئے، دیکھا مروان بنی امیہ کے کچھ افراد کے ساتھ گھر میں موجود ہے۔ مروان نے خلیفۂ سوّم سے کہا، گفتگو کروں یا خاموش بیٹھا رہوں۔ خلیفۂ سوّم کی اہلیہ نائلہ غصے سے کہتی ہیں، ''خاموش ہو جاؤ، خدا کی قسم! تم خلیفۂ سوّم کے قاتل اور ان کے بچوں کو یتیم کرنے والے ہو، اسے چاہیے کہ لوگوں سے جو جو وعدے کیے ہیں انہیں پورا کر دے اور کسی صورت ان وعدوں سے منحرف نہ ہو۔'' مروان بولا: تم نے جو مسجد میں کہا، وہ تمہاری خلافت کے لیے صحیح نہیں اس پر نظر ثانی کرو اور اس پر عمل نہ کرو۔ یہ خبر جب پھیلی کہ ایسا مشورہ ہوا ہے تو حضرت علیؑ غصے کے عالم میں خلیفۂ سوّم کے گھر تشریف لائے اور فرمایا: میں تمہیں صحیح راستہ دکھاتا ہوں اور

مروان تمہیں منحرف کر دیتا ہے۔ آج کے بعد اس سے مشورہ لیا کرو، میں آئندہ تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔

مصر والے جو واپس چلے گئے تھے، تین دن بعد پلٹ آئے اور وہ خط جو خلیفۂ سوّم کے غلام سے راستے میں پکڑا تھا اس کو حضرت علی علیہ السلام کے سامنے رکھا، جس میں خلیفۂ سوّم نے عبداللہ بن صرح کو جو مصر کا گورنر تھا، حکم دیا تھا، جن لوگوں نے فساد پھیلایا ہے ان کے رہبروں کو کوڑے مارو، ان کے سروں اور چہروں کے بالوں کو منڈوا کر قید کر دو اور بعض کے لیے حکم دیا تھا کہ سولی پر لٹکا دو۔ حضرت علیؑ نے اس واقعے کے بارے میں خلیفۂ سوّم کو بتایا، خلیفۂ سوّم نے اس طرح کے کسی خط سے لاعلمی کا اظہار کیا، ایک نے کہا: یہ مروان کا کام ہے، اس پر خلیفۂ سوّم نے کہا، مجھے معلوم نہیں۔

مصریوں نے کہا: کیا مروان اتنا طاقتور ہے کہ خلیفۂ سوّم کے غلام کو بیت المال کے اونٹ پر سوار کر کے خط بھیجے اور جس پر خلیفہ کی مخصوص مہر بھی لگی ہو؟ اتنے خطرناک خط کا بھیجنا اور خلیفۂ سوّم اس سے بے خبر ہیں؟ خلیفۂ سوّم نے پھر کہا، میں اس خط کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ مصریوں نے کہا: دو باتوں میں سے کوئی ایک بات ضرور ہے، اگر یہ مروان کا کام ہے تو تم خلافت چھوڑ دو، کیونکہ اتنا کمزور خلیفہ کہ دوسرے اس کی اجازت کے بغیر مسلمانوں کے قتل عام کا حکم دیں اور خط پر خلیفہ کی مخصوص مہر بھی ثبت ہو، وہ مسلمانوں پر حکومت کرنے کے لائق نہیں۔ اور اگر یہ کام تمہارا ہے اور جھوٹ بول رہے ہو، پھر بھی تم خلافت کے لائق نہیں ہو۔

خلیفۂ سوّم نے کہا: خلافت وہ لباس ہے جو خدا نے مجھے پہنایا ہے، میں اس کو نہیں اتاروں گا، لیکن توبہ کرتا ہوں۔ مصریوں نے کہا: اگر پہلی دفعہ توبہ کرتے تو ہم قبول کر لیتے لیکن تم نے کتنی مرتبہ توبہ کی اور پھر توبہ کے بعد پھر وہی کام کیا لہٰذا تم خلافت چھوڑ دو۔ اس سے کم پر ہم راضی نہیں اور اگر نہیں چھوڑو گے تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے، صورتحال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ تر ہوتی چلی گئی، خلیفۂ سوّم نے حضرت علیؑ سے تین دن کی مہلت مانگی تا کہ لوگوں کی شکایات دور کر کے ان کے مسائل حل کریں، لوگوں نے اس کو مان لیا۔

لیکن خلیفۂ سوّم مخفیانہ انداز سے جنگ کا سامان جمع کر رہے تھے (مہلت مانگنے کا مقصد یہ تھا کہ مدینے کے باہر سے ان کی مدد کے لیے لوگ آ جائیں) تین دن کے بعد خلیفۂ سوّم پر محاصرہ تنگ کر دیا گیا، کیونکہ محاصرہ کرنے والے لوگ خوفزدہ تھے کہ کہیں شام و بصرہ سے مدد کے لیے لوگ نہ آ جائیں، اس لیے خلیفۂ سوّم کا پانی بند کر دیا، تا کہ مطالبہ جلد تسلیم کر لیا جائے۔ خلیفۂ سوّم، حضرت علیؑ سے پانی مانگتے ہیں، امام علیؑ نے اپنے بیٹوں کے ذریعے پانی پہنچوایا۔ اس دوران لوگ خلیفۂ سوّم کے گھر میں داخل ہو گئے اور خوں ریزی شروع ہو گئی، کچھ افراد قتل ہوئے، کچھ افراد خلیفۂ سوّم کے کمرے میں داخل ہو گئے اور اُن کو نصیحتیں کرنے لگے، لیکن خلیفۂ سوّم پر کوئی اثر نہ ہوا، پھر انہوں نے ان پر حملہ کر دیا۔

یہ خلاصہ تھا جو ابن ابی الحدید نے تاریخ طبری سے نقل کیا ہے۔ ہم نے بھی طولانی ہونے کے سبب خلاصہ کر دیا۔ [۱]
بہت سے مورّخ خلیفۂ سوّم کے قتل کو ۱۸ ذی الحجہ سن ۳۵ یا ۳۶ ہجری ذکر کرتے ہیں، حیرت ہے اس پر جو کامل ابن اثیر اور دوسرے مورخین نے لکھا کہ خلیفۂ سوّم کی لاش تین دن تک دفن نہیں ہوئی، اس سے معلوم ہوتا ہے لوگوں کو خلیفۂ سوّم پر کتنا شدید غصہ تھا۔ حضرت علیؑ کی مدد سے ان کے دفن کا بندوبست کیا گیا، کچھ لوگ ان کی نماز جنازہ اور دفن کے مخالف تھے، یہ لوگ راستے میں بیٹھ گئے اور جنازے پر پتھراؤ شروع کر دیا، حضرت علیؑ نے انہیں اس سے روکا۔ نمازِ جنازہ کے بعد ان کو ''حشِ کوکب'' جو بقیع کے باہر کا علاقہ تھا وہاں دفن کر دیا گیا۔ امیر شام کے زمانے میں ''حش کوکب'' کو بقیع میں شامل کر دیا گیا، تاکہ یہ اہانت ختم ہو جائے کہ عثمان بقیع میں دفن نہ ہو سکا۔ [۲]

یہ تمام باتیں واضح کرتی ہیں کہ لوگ کس حد تک خلیفۂ سوّم اور اُن کی حکومت سے ناراض تھے اور یہ بات ان جملوں سے جو امامؑ نے خطبۂ شقشقیہ میں بیان فرمائے، واضح ہو جاتی ہے۔ وہ جو امام علیہ السلام کی ان تعبیروں کو جو آپؑ نے خطبے میں بیان فرمائی ہیں، قبول نہیں کرتے، درحقیقت خلیفۂ سوّم کی زندگی اور ان کے کاموں سے آگاہی نہیں رکھتے، ورنہ وہ تصدیق کرتے کہ امامؑ نے بالکل صحیح تعبیرات استعمال کی ہیں۔

۵۔ کیا تمام صحابہ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے پر گامزن رہے؟

اہل سنّت کے ہاں یہ مشہور ہے کہ تمام صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قابل احترام و عادل تھے۔ کسی نے کوئی کام خدا و قرآن اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستور کے خلاف انجام نہیں دیا جبکہ شیعہ اور اہل بیت علیہم السلام کے چاہنے والے اس بات پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ تمام صحابہ کو ایک جیسا نہ کہو بلکہ ان کے اعمال کے مطابق اچھا یا برا کہا جائے چاہے حیاتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اعمال ہوں یا بعد از رحلت رسولؐ اہل سنت کا یہ نظریہ بہت ساری مشکلات کو جنم دیتا ہے، کیونکہ صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان ایسے افراد ہیں جو بہت سے مسائل میں ایک دوسرے کی ضد ہیں، جس کی توجیہہ ممکن نہیں ہے۔

مثال کے طور پر جنگ صفین میں امیر شام، مولا علیؑ سے جنگ کرتا ہے جبکہ حضرت علی علیہ السلام کو تمام مسلمانوں نے منتخب کیا، کون سا منصف مزاج مورّخ اس وحشت ناک کام کی توجیہہ پیش کر سکتا ہے۔ یا طلحہ و زبیر نے حضرت علیؑ کے خلاف بغاوت کی اور جنگ جمل میں کتنا خون بہایا گیا، بہت سے مورّخ ۱۷ ہزار سے زیادہ افراد بیان کرتے ہیں، جو جنگ جمل میں

---

[۱] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۲، ص ۱۲۹ تا ۱۵۸
[۲] کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۱۸۰

قتل ہوئے، آیا ان افراد کو ان واقعات کے بعد بھی عادل مانا جا سکتا ہے۔

خلیفۂ سوّم کے بارے میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے تمام مورّخین اسلام اجمالاً قبول کرتے ہیں کہ دو اہم وجوہات کی بنا پر انہوں نے یہ سختی برداشت کی، ایک یہ کہ اہم وحساس عہدے بنی امیہ کو سونپے گئے اور دین سے دور افراد کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا گیا، جس کے نتیجے میں مختلف علاقوں سے آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ دوسرے بیت المال کا بے جا استعمال، وسیع پیمانے پر ہدایا ونذورات کا دیا جانا یہ بھی نا قابل توجیہہ ہے۔

آیا اس طرح کے امور انجام دینے کے باوجود تمام صحابہ کے پاک ہونے، ان کی بزرگی واحترام کا قائل ہونا، مناسب ہے یا ہم استثنیٰ کے قائل ہوں، یعنی تمام صحابہ قابل احترام نہیں بلکہ اپنے اعمال کی وجہ سے محترم ہیں۔ اگر آپ توجیہہ کریں صحابہ کے کاموں کی تو کون سا فعل ایسا ہے جس کی توجیہہ نہ کر سکیں؟ اس کلام نے مجھے ایک ایسے واقعے کو یاد دلا دیا جو خود میرے ساتھ پیش آیا، جس کو بھلا نہیں سکتا، ایک سال عمرہ ادا کرنے کے لیے گیا، موقع میسر آیا کہ اہل سنّت کے دانشمندوں سے مل سکوں، خصوصاً رات کے وقت اور مغرب وعشاء کے درمیان مسجد الحرام میں موقع ملتا تھا ان سے گفتگو کرنے کا، ایک رات ان برادران اہل سنّت کے افراد (جن میں بعض معروف افراد بھی تھے) کے ساتھ خانۂ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر گفتگو ہوئی، کوشش یہ تھی کہ گفتگو علمی رہے اور منطق واستدلال کے علاوہ نہ ہو، تاکہ دل آزاری کا سبب نہ بنے۔

مسئلہ صحابہ کی تنزیہ اور عدالت کا بھی آ گیا، وہ معتقد تھے کہ چھوٹے سے چھوٹا لفظ بھی استعمال نہ کریں جس سے ان کی توہین کا پہلو سامنے آئے، میں نے ایک سے سوال کیا، اگر آپ صفین میں ہوتے تو آپ امیر شام کے لشکر میں ہوتے یا حضرت علیؑ کے لشکر میں؟ اس نے فوراً کہا، حضرت علیؑ کے لشکر میں۔ میں نے کہا، اگر حضرت علیؑ تمہیں تلوار دیتے اور کہتے ''خُذْ هٰذَا وَاُقْتُلْ مُعَاوِيَةَ'' یہ تلوار لو اور امیر شام کو قتل کر دو۔ تو تم اطاعت کرتے؟ اس نے عجیب سا جواب دیا شاید آپ کو بھی چونکا دے، اس نے کہا: ''كُنْتُ اَقْتُلُهُ وَلَا اَذْكُرُهُ بِسُوْءٍ'' میں اس کو قتل کر دیتا لیکن کوئی ایسا کام یا کلام نہ کرتا، جس سے اس کی توہین ہوتی ہو۔ ''تنزیہ صحابہ'' کا قصہ بہت طویل ہے، یہاں گنجائش نہیں کہ اس کو اور زیادہ وضاحت سے بیان کیا جائے۔

چوتھا حصّہ

فَمَا رَاعَنِي اِلَّا وَ النَّاسُ كَعُرْفِ الضَّبُعِ اِلَيَّ يَنْثَالُونَ عَلَيَّ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ حَتّٰى لَقَدْ وُطِئَ الْحَسَنَانِ وَ شُقَّ عِطْفَايَ مُجْتَمِعِيْنَ حَوْلِيْ كَرَبِيضَةِ الْغَنَمِ فَلَمَّا نَهَضْتُ بِالْاَمْرِ نَكَثَتْ طَائِفَةٌ وَ مَرَقَتْ اُخْرٰى وَ قَسَطَ آخَرُونَ كَاَنَّهُمْ لَمْ يَسْمَعُوا اللهَ سُبْحَانَهُ يَقُولُ تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا

لِلَّذِینَ لا یُرِیْدُونَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَ لا فَسادًا وَ الْعاقِبَةُ لِلْمُتَّقِینَ بَلٰی وَ اللهِ لَقَدْ سَمِعُوْهَا وَ وَعَوْهَا وَ لٰکِنَّهُمْ حَلِیَتِ الدُّنْیَا فِیْ اَعْیُنِهِمْ وَ رَاقَهُمْ زِبْرِجُهَا.

''اُس وقت مجھے جس چیز نے دہشت زدہ کر دیا، یہ تھی کہ لوگ بجّو کی گردن کے بال کی طرح میرے گرد جمع ہو گئے اور چاروں طرف سے میرے اوپر ٹوٹ پڑے، یہاں تک کہ حسنؑ و حسینؑ کے کچل جانے کا خدشہ پیدا ہوا اور میری ردا کے کنارے پھٹ گئے۔ یہ سب میرے گرد بکریوں کے گلے کی طرح گھیرا ڈالے ہوئے تھے، لیکن جب میں نے ذمے داری سنبھالی اور اٹھ کھڑا ہوا تو ایک گروہ نے بیعت توڑ دی اور دوسرا دین سے باہر نکل گیا اور تیسرے نے فسق اختیار کر لیا، جیسے کہ ان لوگوں نے یہ ارشادِ الٰہی سنا ہی نہیں ہے کہ ''یہ دارِ آخرت ہم صرف ان لوگوں کے لیے قرار دیتے ہیں جو دنیا میں بلندی اور فساد نہیں چاہتے ہیں اور عاقبت صرف اہل تقویٰ کے لیے ہے۔'' ہاں ہاں خدا کی قسم! ان لوگوں نے یہ ارشاد سنے بھی ہیں اور سمجھے بھی، لیکن دنیا ان کی نگاہوں میں آراستہ ہو گئی اور اس کی چمک دمک نے انہیں لبھا لیا۔''

شرح و تفسیر

بیعت کے موقع پر حضرت امام علی علیہ السلام کا خطبہ

امام علی علیہ السلام خطبے کے اس حصے میں اپنی خلافت کے زمانے، خصوصاً بیعت کے وقت کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔ کس طرح لوگ عجیب و حیرت انگیز طریقے سے امامؑ کی بیعت کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ایسی بیعت جس کی مثال تاریخ اسلام میں کہیں اور نظر نہیں آتی لیکن جب حق و عدالت کا وقت آیا تو لوگ عدالت کے متحمل نہیں ہو سکے اور آپؑ کے مخالف ہو گئے اور انہوں نے جنگ جمل و صفین اور نہروان کی آگ کو بھڑکا دیا۔ مسلمانوں کی صفوں میں شگاف ڈالا اور امامؑ کے کاموں میں مانع ہوئے تا کہ اسلامی معاشرہ اپنے کمال تک نہ پہنچ سکے، پہلے آپؑ بیان فرماتے ہیں:

"فَمَا رَاعَنِیْ [1] إِلَّا وَ النَّاسُ کَعُرْفِ [2] الضَّبُعِ [3] اِلَیَّ یَنْثَالُوْنَ [4] عَلَیَّ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ"

''کسی چیز نے مجھے پریشان نہیں کیا سوائے اس کے کہ اچانک میں نے دیکھا لوگ کثیر تعداد میں میری طرف آرہے ہیں اور ہر طرف سے گروہ در گروہ میرا رخ کررہے ہیں۔''

تعبیر، یعنی بجُّو کا ازدحام اشارہ ہے ایسے مجمع کی طرف جو بہت زیادہ ہو، ایسا مجمع جہاں سر ہی سر نظر آئیں، جو بیعت کرنے آئے تھے، کیونکہ بجُّو کا ازدحام ضرب المثل ہے، جو ایسے مواقع کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

اس ازدحام سے جو ناگاہ بیعت کے لیے لوگوں کے جمع ہونے کی وجہ سے تھا، امامؑ کی تشویش شاید اس لیے تھی کہ بیعت کے ذریعے ایک اہم ذمہ داری آپ کے کاندھوں پر آرہی تھی بالخصوص دنیا پرستوں کی بیعت کو توڑنے کی پیش بینی ''خطبہ ۹۲'' میں اس مطلب کو وضاحت کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں کہ امامؑ نے لوگوں کی بیعت اور خلیفۂ سوّم کے قتل کے بعد اس طرف توجہ دلائی ہے، ممکن ہے اس فکر کا سبب وہ حاسد لوگ ہوں جن کے دل سیاہ تھے۔ وہ بیعت اور قتل عثمان میں کوئی سلسلہ جوڑ دیں۔ پھر امامؑ بیان کو بڑھاتے ہوئے تین جملوں کا اضافہ کرتے ہیں:

"حَتّٰی لَقَدْ وُطِیءَ الْحَسَنَانِ، وَشُقَّ عِطْفَایَ، مُجْتَمِعِیْنَ حَوْلِیْ کَرَبِیضَةِ الْغَنَمِ"

''(ہجوم اس قدر زیادہ تھا) ممکن تھا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشانیاں یعنی امام حسن و حسین علیہما السلام پامال ہو جائیں اور میری ردا دو طرف سے پھٹ گئی، یہ سب اس حال میں تھا کہ لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح، جو بھیڑیئے کے خوف سے چرواہے کے گرد جمع ہو جائیں، میرے گرد جمع تھے۔''

الحسنان سے مراد اکثر شارحین کے مطابق امام حسن و حسین علیہما السلام ہیں۔ اس وقت ان دونوں معصومینؑ کی عمر تیس سال سے زیادہ تھی، جوان تھے لیکن لوگوں کا ہجوم اس قدر تھا کہ آپؑ دونوں اپنے والد کی حفاظت میں ایک تنگ راستے میں پھنس گئے۔ لیکن بعض مفسروں نے دو اور احتمال دیے ہیں:

---

[1] راعنی، مادّہ روع سے ہے۔ بروزنِ نوع۔ اس کے معنی خوف و وحشت کے ہیں کبھی حیرانی کے معنی میں بھی آتا ہے۔

[2] عرف دراصل بمعنی اس چیز کے ہے جو ایک دوسرے کے پیچھے واقع ہو اور کثرت کی صورت میں ہو۔ اس دلیل کی بنا پر جانوروں کی گردنوں پر بھی اطلاق ہوتا ہے کیونکہ کثیر بال جو پشتِ گردن پر ہوں انہیں تشکیل دیتے ہیں۔

[3] ضبع، مقائیس کے مطابق اس کے تین معنی ہیں (۱) مشہور حیوان بجُّو (۲) انسان کا عضو بازو (۳) اونٹنی کی ایک صفت کبھی یہ سال قحطی سے کنایہ ہے، کیونکہ ایسے وقت بجُّو انسانوں پر حملہ کرنے لگتے ہیں۔

[4] ینثالون مادّہ ثول بروزن قول ہے، معنیٰ شہد کی مکھیوں کی کثرت کے ہیں، جب وہ آمد و رفت کے وقت جمع ہوتی ہیں، پھر ہر اس مجمع کے لیے استعمال ہوتا ہے جو بہت زیادہ ہو۔ (مقائیس اللغۃ، صحاح، لسان العرب)

پیر کی دو بڑی انگلیاں ہیں جس طرح سیّد مرتضیٰ نے بیان کیا ہے۔ آپ نے ارباب لغت (ابو عمر) سے نقل کیا ہے۔ اور عرب کے اشعار کی مثال لے کر آئے ہیں۔ لیکن انگلیوں کا پامال ہونا تو ایک کم مجمع میں بھی ہوسکتا ہے تو ازدحام کا ذکر کرنا مناسب نہیں لگتا۔ اور تیسری تفسیر ہے جس کو بعض نے ذکر کیا ہے: وہ یہ ہے کہ دو ہاتھ کی ہڈیاں مراد لی ہیں چاہے وہ بازو کی ہڈیاں ہوں یا کلائی کی، یہ ہڈیاں پامال نہیں ہوتیں، صرف اس صورت میں ممکن ہے جب انسان زمین پر گر جائے اور لوگوں کے پیروں تلے روندا جائے۔

"رَبِیْضَةِ الْغَنَمِ" کی تشبیہ، بھیڑیں جو ایک غول کی صورت میں جمع ہوں، لوگوں کی نادانی کی طرف اشارہ نہیں ہے، جیسا کہ بعض شارحین کا خیال ہے بلکہ اس طرف اشارہ ہے، جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ جس طرح بھیڑیں بھیڑیئے کے خوف سے چرواہے کے گرد جمع ہو جائیں۔ خلیفۂ سوّم کے دور میں لوگ منتشر ہو گئے تھے، وہ وحدت کے رشتے میں جڑ گئے اور امامؑ کو اتصال کا ذریعے قرار دیا اور مولاؑ کے گرد جمع ہو گئے، لیکن صد افسوس یہ اطمینان وسکون زیادہ دیر باقی نہ رہ سکا، جب امتحان کی منزل آئی تو اپنے وعدہ کو وفا نہ کر سکے۔

امامؑ آگے فرماتے ہیں:

"فَلَمَّا نَهَضْتُ بِالْاَمْرِ نَكَثَتْ طَائِفَةٌ، وَمَرَقَتْ اُخْرٰى [1] وَقَسَطَ [2] آخَرُوْنَ"

''امرِ خلافت کے قیام کے وقت لوگوں نے عہد توڑ دیا (فضول بہانے بنا کر اطاعت سے منہ موڑ لیا) دین خدا سے فرار کیا۔ دوسرے گروہ نے ظلم کا راستہ اختیار کیا اور حق کی اطاعت سے سرکشی کی۔''

یہ تین گروہ جس طرح اکثر یا سب شارحین نے کہا، وہ ہیں جنھوں نے جنگ جمل ونہروان وصفین کی آگ کو بھڑکایا یعنی ان جنگوں کا سبب بنے۔ جنگ جمل کی آگ لگانے والے (طلحہ وزبیر تھے جنہوں نے حضرت عائشہ کو استعمال کیا) یہ ناکثین تھے یعنی عہد توڑنے والے۔ انھوں نے امام علی علیہ السلام کی بیعت کی لیکن خلافت میں جب ان کی امیدیں (یعنی

---

[1] مرق، مادّہ مروق (غروب کے وزن پر) سے ہے خارج ہونے کے معنی میں ہے، جو کسی شے سے خارج ہوگئی ہو۔ تیر ہدف کی طرف جائے، صحاح اللغۃ اور لسان العرب۔ مفہوم یہ ہے کہ تیر اپنے ہدف سے گزر جائے۔ اس وجہ سے خوارج کو مارقین کہتے ہیں کیونکہ وہ افراطی ومتعصب ولج باز تھے اور امام علیؑ سے زیادہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے۔

[2] قسط، کبھی ظلم اور حق سے پھر جانے کے لیے آتا ہے قسط (فقط کے وزن پر) ان افراد کو کہتے ہیں جن کے پیر کج ہوں کبھی عدالت کے لیے آتا ہے۔ راغب نے مفردات میں قسط کے معنی حصہ وسہم کے لکھے ہیں۔ جب کسی کا حصہ لیا جائے، اُسے قسط کہتے ہیں یہ ظلم کا مصداق ہے۔ اقساط کسی کے حصے کو ادا کرنا یہ عین عدالت ہے، دونوں معنی ایک ہی اصل سے لیے گئے۔ لسان العرب میں حضرت علیؑ سے حدیث نقل ہوئی ہے کہ (اُمِرْتُ بِقِتَالِ النَّاكِثِيْنَ وَالْقَاسِطِيْنَ وَالْمَارِقِيْنَ) کی ہے پھر لسان العرب اضافہ کرتا ہے۔ (۱) یہی معنی تلخیص المستدرک ذہبی میں بھی آئے ہیں۔ اسد الغابہ، ج ۴، ص ۳۳۔

خلافت میں ان کے لیے عہدے اور اختیارات) پوری نہ ہوئیں تو بصرہ آ گئے اور مخالفت کی آگ بھڑکا دی، نہروان کی آگ لگانے والے مرق یعنی خوارج تھے۔ صفین میں حکمین کے بعد امام علیؑ کے خلاف ہو گئے اور علم بغاوت بلند کیا، ''مروق'' کے معنی اس تیر کے ہیں جو کمان سے نکل جائے۔ پہلے حق کے دائرے میں تھے، پھر تعصب و خود خواہی کی وجہ سے خارج ہو گئے۔

قاسطین: اہل شام اور امیر شام کا لشکر ہے، کیوں کہ قسط کبھی عدالت اور کبھی ظلم و فسق کے معنی میں آتا ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ مثالیں ان تین گروہوں کے بارے میں اسلامی مدارک میں موجود ہیں، جن کی پیش گوئی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارکہ میں کر دی گئی تھی۔

حاکم نیشاپوری نے مستدرک الصحیحین میں ابوایوب انصاریؓ سے نقل کیا ہے:

''اَمَرَ رَسُوْلُ اللهِ عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ بِقِتَالِ النَّاکِثِیْنَ وَ الْقَاسِطِیْنَ وَ الْمَارِقِیْنَ''

''رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کو ناکثین، قاسطین، مارقین سے جنگ کا حکم دیا۔''[۱]

اسد الغابہ میں بھی دو روایات حضرت علیؑ کے حالات بیان کرتے ہوئے آئی ہیں۔ اور تاریخ بغداد میں اسے یوں بیان کیا ہے کہ ابوایوب نقل کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ''حضرت علی علیہ السلام کا ساتھ دیتے ہوئے ناکثین، مارقین و قاسطین کے تین گروہوں سے جنگ کرو''۔

ناکثین: جن لوگوں سے حضرت علی علیہ السلام نے جنگ کی وہ اہل جمل، طلحہ و زبیر تھے۔

قاسطین: سے مراد یہی لوگ ہیں کہ جن سے پیکار کے بعد ہم لوٹ رہے ہیں یعنی امیر شام اور عمرو ابن عاص۔ ابوایوب فرماتے ہیں:

مارقین: اہل نہروان تھے، (ابوایوب نے) فرمایا:

''خدا کی قسم! نہیں معلوم یہ لوگ کہاں ہیں لیکن ہر حال میں ہم ان سے جنگ کریں گے۔''[۲]

یہ دندان شکن جواب ہے ان لوگوں کے لیے جو جہالت اور ناآگاہی کی وجہ سے امیر المومنینؑ کے دور خلافت میں ہونے والی جنگوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ یہ لوگ بیعت کے وقت حضرت علیؑ کے گرد اس طرح جمع تھے، جیسے شمع کے گرد پروانے، لیکن جب عدالت کے نفاذ کا معاملہ آیا تو عدالت کو برداشت نہیں کر سکے۔ ایک مدت تک بیت المال غارت ہوتا رہا، بے عدالتی ہوتی رہی، اور یہ لوگ اس کے عادی ہو گئے۔ اس لیے جب عدل قائم ہوا تو اس کو قبول کرنا ایسے لوگوں کے لیے

---

[۱] مستدرک الصحیحین، ج ۳، ص ۱۳۹

[۲] تاریخ بغداد، ج ۱۳، ص ۱۸۷، طبع دار الفکر

بہت دشوار تھا، اس وجہ سے صرف وفادار، مومن و خالص افراد اپنے عہد یعنی بیعت پر باقی رہے، لیکن دوسرے لوگ دنیا پرستی کی خاطر خدا و خلیفہ سے کیے ہوئے وعدے کو توڑ گئے یہ وہی چیز ہے جس کی طرف امام علیہ السلام بعد والے خطبے میں ان کی طرف سے مخالفت کی اصل وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"كَأَنَّهُمْ لَمْ يَسْمَعُوا كَلامَ اللهِ سُبْحَانَهُ يَقُولُ تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوّاً فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَاداً، وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ" [1]

''ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے انہوں نے کلامِ خدا سنا ہی نہیں، جو فرماتا ہے: ''سرائے آخرت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو نہ برتری چاہتے ہیں نہ متکبّر ہیں نہ زمین پر فساد کرنے والے ہیں۔ اور عاقبت (نیک) پرہیز گاروں کی ہے۔''

مزید فرماتے ہیں:

"بَلٰى وَاللهِ لَقَدْ سَمِعُوهَا وَوَعَوْهَا [2] وَلٰكِنَّهُمْ حَلِيَتِ الدُّنْيَا فِي أَعْيُنِهِمْ، وَرَاقَهُمْ [3] زِبْرِجُهَا" [4]

''ہاں خدا کی قسم! اس کو انہوں نے سنا تھا اور انہیں یاد تھا، لیکن دنیا کی چکا چوند، روشنی نے ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا، دنیا کی زینت نے ان کو فریفتہ کر لیا تھا۔''

پہلے آپ انہیں ناواقف افراد کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں کہ جنکی ہٹ دھرمی صرف اور صرف ان کی جہالت کی وجہ سے ہو۔ اور پھر آپ بڑی صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ: یہ لوگ حقائق سے کبھی بے خبر نہیں تھے، لیکن خلیفۂ سوّم کے زمانے میں اسلامی فتوحات سے غنائم کی فراوانی کی وجہ سے جب ان کی زندگی عیش پرست ہوگئی تو یہ بات سبب بنی کہ یہ لوگ دین پر دنیا کو ترجیح دیں۔ اور آخرت کو دنیا کی حقیر چیزوں کے بدلے فروخت کر دیا۔

آخرت کو متاعِ دنیا کے عوض ہاتھ سے کھو دیا

---

[1] سورۂ قصص آیت ۸۳

[2] وعوھا، مادّہ وعی سے ہے نفی کے وزن پر، مقائیس کے مطابق کسی شے کو ضمیمہ کے معنیٰ میں آتا ہے۔ مفردات کے بقول حفظ حدیث یا اس طرح کے معنیٰ میں آتا ہے (دونوں ایک ہی معنیٰ کی طرف پلٹتے ہیں)

[3] راق، روق سے ہے۔ مقائیس کے مطابق کسی شے کو کسی پر مقدم کرنے کے لیے آتا ہے۔ کبھی حسن و جمال کے لیے آتا ہے۔ اس لیے گھر کے پہلے حصے کو (گھر یا حرم مقدسہ کو) رواق کہتے ہیں۔ امامؑ کے کلام میں حسن و جمال کے لیے آیا ہے۔

[4] زبرج، سونے سے زینت اور کبھی کپڑے کے نقش و نگار کے لیے آتا ہے۔ واضح ہے کہ مذکورہ جملے اور اس سے پہلے والے تمام جملوں میں مذکور (ھا) کی ضمیروں کا مرجع تین گروہ ہیں (ناکثین، مارقین، قاسطین) لیکن علامہ مجلسی بحار میں فرماتے ہیں یہ ضمیریں خلفاء ثلاثہ کی طرف پلٹ رہی ہیں۔ لیکن یہ احتمال بعید ہے۔ اس لیے آخر میں علامہ مجلسی اس احتمال کو بیان کرتے ہیں کہ ضمیر ھا انا فراد کی طرف پلٹ رہی ہے جن کا تذکرہ خطبے میں ہوا۔

مختصر کلام یہ کہ حقیقت میں یہ تمام تحلیلوں کا ماحصل ہے، جو تین جنگوں کے بارے میں بیان ہوا، جو امام علی علیہ السلام کے زمانے میں ہوئیں۔ جس نے اس کے علاوہ جو کچھ کہا، اس کی شاخیں و پتّے ہیں۔ یہ درحقیقت تمام مسلمانوں کے لیے درس عبرت ہے، تاریخ کے طویل دور میں ہر زمانے میں دنیا پرستی عام رہی ہے اور جو لوگ اس کی لذتوں اور دلفریبی کا شکار ہو گئے، ان میں اختلافات اپنے پورے عروج پر پہنچ گئے اور تمام اصولِ وحدت ان سے رخصت ہو گئے۔ صرف وہ گروہ اس آفت سے محفوظ رہا جس نے تقویٰ اور پرہیزگاری کو شعار بنایا اور خودسازی اختیار کی۔ آج بھی اگر غور کیا جائے تو مسلمانوں کے تمام اختلافات کی بنیادی وجہ وہی ہے جو امامؑ نے آیۂ قرآنی کی روشنی میں اپنے مندرجہ بالا مختصر جملوں میں بیان کر دی ہے یعنی دنیا میں بلند مرتبہ حاصل کرنا اور پھر یہاں فساد پھیلانا اور دنیا کی چمک دمک اور اس کی دل فریبی پر فریفتہ ہو جانا اور تاکید فرماتے ہیں کہ آخرت کی کامیابی صرف ان کے لیے ہے جو ذاتی برتری اور زمین میں فساد کرنے کی خواہش نہیں رکھتے۔

نکات

۱۔ حضرت علیؑ کی بیعت عمومی تھی

یہ بیعت اُن تمام بیعتوں سے مختلف تھی جو خلفا کے زمانے میں لی گئیں، اس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں تھا۔ لوگوں نے جوش و خروش کے ساتھ بیعت کی، اُن لوگوں نے بیعت کی جو ظلم کا شکار تھے۔ یہ سقیفہ کی طرح نہیں تھی، جس میں چند افراد نے اپنی رائے عوام پر مسلط کر دی تھی، نہ خلیفۂ دوّم کی بیعت کی طرح تھی، جو صرف پہلے خلیفہ کے کہنے پر عمل میں آئی، نہ خلیفۂ سوّم کی طرح تھی، جس میں چھے آدمیوں کی شوریٰ نے خلیفہ منتخب کیا۔ یہ ایک واقعی اور حقیقی بیعت تھی، اس بیعت نے دوسری بیعتوں کی بھی وضاحت کر دی۔

بعض شارحین نہج البلاغہ نے لکھا کہ خلیفۂ سوّم کے خلاف قیام کرنے والے خلیفۂ سوّم کے قتل کے بعد حضرت امام علیؑ کا رخ کرتے ہیں تاکہ خلافت کے لیے ان کی بیعت کریں، مگر آپؑ تیار نہیں ہوئے جب اصرار کیا تو فرمایا، میں تمہارا امیر بننے سے بہتر ہے وزیر رہوں۔ "اَنَا لَکُمْ وَزِیْراً خَیْرٌ مِنِّیْ اَمِیْرًا"

آپؑ جانتے تھے ایسی بیعت کے بعد خلیفۂ سوّم کے قتل (الزام) کی تہمت آپؑ پر لگ جائے گی۔ اگر صرف وہ بیعت کرتے تو کچھ لوگ کہتے صرف خلیفۂ سوّم کے قاتلوں نے امام علیؑ کی بیعت کی ہے، آپؑ ان کی پیشانیوں میں دیکھ رہے تھے کہ یہ سب حق کو قبول کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، کیوں کہ حق کڑوا ہوتا ہے۔

بعد میں جب انصار و مہاجرین امام علیہ السلام کے پاس آئے اور انہوں نے اصرار کیا کہ آپؑ خلافت کو قبول کرلیں، تب امام علیہ السلام کے پاس کوئی چارہ نہ تھا آپؑ منبر پر تشریف لائے، صرف چند افراد کے علاوہ تمام لوگوں نے آپؑ کی بیعت کی، امامؑ نے ان سے اصرار نہیں کیا کہ وہ بیعت کریں۔ ان میں سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن عمر وغیرہ تھے۔ [1]

ہمارے عقیدے کے مطابق اور نا قابل انکار حوالوں کے مطابق امام علی علیہ السلام خدا کی طرف سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین تھے۔ صرف غدیر خم ہی نہیں، بلکہ دوسرے متعدد مقامات پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاکید فرمائی، یہاں اس کی شرح کی گنجائش نہیں۔ اگرچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ایک گروہ مخالف ہو گیا لیکن خلیفۂ سوّم کے قتل کے بعد انھوں نے امام علیؑ کی بیعت کی اور اس طرح حمایت کی کہ کسی بھی انصاف پسند ملت (ڈیموکریسی) میں اس طرح کی حمایت نظر نہیں آتی، صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں بیعتِ شجرہ کے مقام پر ایسی بیعت نظر آتی ہے۔ لوگ اس لیے امام علی علیہ السلام کی بیعت کر رہے تھے، کیونکہ وہ امام علی علیہ السلام کے علم و تقویٰ سے آگاہ تھے اور کوئی سیاسی وجہ نہیں تھی جس کی وجہ سے بیعت کر رہے تھے، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اپنے مقاصد کو امام علیؑ کے ذریعے حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر پہلے ہی لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جاتا، ان کو اُکسایا نہ جاتا تو ایسا معاشرہ تشکیل پاتا جو عدالت کا پیکر ہوتا، جس طرح قرآن نے بیان کیا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دور عثمانی میں بیت المال کے پروردہ غاصب اور میدان سیاست میں اپنی سیاست چمکانے والے ایک بڑے گروہ نے یہ سب کچھ نہ ہونے دیا، انہوں نے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے لوگوں کے جذبات سے کھیلنا شروع کیا اور ان کے مذہبی احساسات کو اپنی سیاسی بازیگری کا وسیلہ بنا کر جمل و صفین و نہروان میں اسلام کی مضبوط دیواروں میں گہری دراڑیں ڈال دیں۔

۲۔ اجتماعی انحرافات کا سرچشمہ

امام علیؑ مذکورہ جملوں میں فرماتے ہیں کہ آپ کے دور میں (اور حقیقتاً ہر دور میں) انحرافات کا اصل سبب حب دنیا اور دنیا کی رنگینیوں میں گم ہو جانا ہے اور جمل و صفین اور نہروان کا سبب بھی آپ یہی بتاتے ہیں اور قرآن کی آیت کو بیان کرتے ہیں، جس میں کہا گیا ہے کہ آخرت ان کے لیے ہے جو برتری اور زمین پر فساد کا ارادہ نہیں رکھتے۔ یہ چند مختصر جملے ایک حقیقت کو بیان کرتے ہیں جو تمام تاریخ بشریت میں نظر آتی ہے۔ ہر جگہ برتری کی تلاش، جنگوں اور اختلافات کا سبب بنتی ہے۔

---

[1] فی ظلال نہج البلاغہ، ج ۱، ص ۹۴

نفس پرستی، خودخواہی زمین پر فساد کا سبب بنتی ہے۔ اسی بنا پر اگر ہم ان شیطانی خصلتوں کا ایمان و اعتقاد کے ذریعے مقابلہ نہ کریں اسلامی معاشرے میں تو ہمیشہ خون بہتا رہے، جنگیں ہوتی رہیں، یہاں تک کہ جو افراد انسانی آزادی، حقوق بشر کے علم بردار ہیں، وہ بھی ان مقاصد کے حصول کے لیے ان چیزوں کو وسیلہ بناتے ہیں اور امامؑ ان کے بارے میں گفتگو فرماتے ہیں، جن کے اعتقاد اور عمل میں تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ ظاہری طور پر مسلمان ہیں۔ انہوں نے قرآنی آیات جن میں "تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةِ" کو سنا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن نفس پرستی نے اور دنیا سے محبت نے ان کے ایمان و اعتقاد کو ہلا دیا ہے، جس طرح بڑا طوفان دھچکا لگاتا ہے اور کمزور بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہ انجام ان تمام لوگوں کا ہے جنہوں نے اپنے ایمان کو کمزور کر دیا اور ہوا و ہوس کو زندگی کا مقصد بنایا ہے۔

۳۔ حضرت علیؑ کے دور میں تین جنگوں کی طرف اشارہ

مذکورہ خطبے میں جنگ جمل، صفین اور نہروان کہ جن کے وابستہ افراد کو ناکثین، مارقین اور قاسطین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اسی بنا پر ان تینوں جنگوں کا ہم اجمالی جائزہ لیتے ہیں:

جنگ جمل

حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کیے ہوئے ابھی تین ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ کچھ لوگ عدالت امام علیؑ کو برداشت نہ کر پائے۔ اور ان کی طرف سے امام علی علیہ السلام کی مخالفت شروع ہوگئی، شام میں امیر شام نے بیعت سے انکار کرتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام کی مخالفت کی اور آپؑ سے جنگ کے لیے تیار ہوا۔ حضرتؑ نے کوفہ، بصرہ اور مصر کے حاکموں کو خطوط لکھے تاکہ امیر شام سے جنگ کے لیے اپنی فوجوں کو تیار کریں۔ اس دوران طلحہ و زبیر عمرے کا کہہ کر مکہ چلے گئے اور وہاں حضرت عائشہ جو کہ (آپؑ کی بیعت سے ناراض تھیں) سے ملاقات کی اور انہیں بصرہ لائے تاکہ خونِ خلیفۂ سوّم کا بدلہ لینے کے لیے فتنے کی آگ بھڑکا سکیں، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہ خونِ خلیفۂ سوّم کی فکر میں تھے اور نہ اسلام سے کوئی ہمدردی رکھتے تھے۔ کیونکہ قاتلانِ خلیفۂ سوّم بصرے میں نہیں تھے؟ سوائے خلیفۂ سوّم کی طرفداری کرنے اور حضرت امیر المومنینؑ کی مخالفت کے کچھ نہیں تھا؟ اور طلحہ و زبیر خود ان افراد میں سے تھے، جنہوں نے خلیفۂ سوّم کے خلاف جنگ کی واضح رہے کہ ان کی پیمان شکن (چوں کہ وہ حضرت علیؑ کی بیعت کر چکے تھے) کا ہدف مقام و منصب تک پہنچنا تھا، یہ دونوں حضرت عائشہ کو لے کر ربیع الثانی ۳۶ھ میں بصرہ آئے اور لوگوں کو گمراہ کرنے اور ان سے بیعت لینے لگے، تاکہ اسلامی

معاشرے میں رخنہ ڈال سکیں۔

امیر المومنینؑ ان حالات سے بخوبی آگاہ تھے، آپؑ نے وہ لشکر جو شامیوں سے لڑنے کے لیے تیار کیا تھا، اُسے بصرے کی جانب روانہ کر دیا اور ایک خط کوفے کے حاکم ابوموسیٰ اشعری کو طاقتور لشکر تیار کرنے کے لیے لکھا، مگر ابوموسیٰ نے کوئی مثبت جواب نہیں دیا اور ۹ ہزار دوسرے لوگ کوفے سے امام علیہ السلام کی نصرت کے لیے روانہ ہوئے، جمادی الآخر میں دو عظیم لشکر آمنے سامنے ہوئے۔ تاریخ یعقوبی کے مطابق یہ جنگ چار گھنٹے چلی، طلحہ و زبیر کا لشکر شکست کھا گیا، حضرت عائشہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ تھیں، ان کو اونٹ پر بٹھا کر لائے تھے اور اس لیے اس جنگ کا نام جمل پڑا، اونٹ کے گرد گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی امام علیہ السلام نے حکم دیا: جب تک یہ اونٹ سالم ہے جنگ جاری رہے گی اس لیے اونٹ کے پیروں کو کاٹ دو، جب اونٹ کے پیر کٹے تو جنگ ختم ہوگئی، طلحہ و زبیر قتل ہوئے (طلحہ میدان جنگ میں مروان کے ذریعے اور زبیر میدان جنگ سے باہر) ماہِ مبارک رجب کی پہلی تھی کہ امیر المومنینؑ نے حضرت عائشہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احترام میں عزت و احترام کے ساتھ مدینہ روانہ کیا، اس جنگ میں بعض تاریخوں کے مطابق دس ہزار، ایک اور روایت کے مطابق سترہ ہزار افراد دونوں طرف سے قتل ہوئے۔ اس خون کی ذمے داری ان پر ہے جنہوں نے اس جنگ کے لیے اقدامات کیے۔ [1]

جنگ صفین

جنگ جمل کے بعد حضرت علی علیہ السلام کوفہ تشریف لائے، امیر شام کو خط لکھا کہ وہ بیعت کرے اور آپؑ کی اطاعت کرے، لیکن امیر شام نے جواب دینے میں تاخیر کی اور شام کے لوگوں کو خلیفۂ سوّم کے خون کا بدلہ لینے کے لیے اُکسایا، سب جگہوں پر اعلان کرایا کہ خلیفۂ سوّم کے قاتل علیؑ ہیں اور حضرت علیؑ کو خط لکھا کہ وہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں، شام کے لوگوں کو جنگ کے لیے جمع کیا، اُدھر حضرت علیؑ نے کوفہ کے لوگوں کو صفین کی طرف بھیجا، اکثریت نے اتفاق آپ کی دعوت قبول کی اور میدان میں آ گئے۔ امامؑ نے اپنی فوج کو چند دَستوں میں تقسیم کیا اور ہر دستے کا ایک کمانڈر مقرر کیا، ہر ایک کی ذمے داری معین کی، امامؑ اور شام کی افواج محرم الحرام کے اختتام سے آٹھ دن پہلے ۳۷ھ میں صفین کے میدان میں پہنچیں۔

یہ تقریباً ایک لاکھ افراد تھے۔ جوں ہی امیر شام کا لشکر پہنچا تو امامؑ کے بعض ساتھیوں نے چاہا کہ جنگ شروع کی جائے، امیر شام نے خط لکھا کہ جنگ میں جلدی نہ کریں، اُدھر امامؑ کی حتی الامکان کوشش تھی کہ جنگ نہ ہو، لہٰذا جنگ سے اپنے لشکر کو روکا، بارہا خط لکھا تا کہ امیر شام اپنی غلطی کو چھوڑ دے اور مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو جائے اور اختلافات کو گفتگو

---

[1] جو واقعہ اوپر بیان ہوا، تاریخ کامل ابن اثیر، جلد ۳ (خلاصہ)

کے ذریعے حل کرے، اس طرح کئی مہینے گزر گئے۔ ایک گروہ بے چینی سے امامؑ سے جنگ شروع کرنے پر اصرار کر رہا تھا، مگر امامؑ نے ہر مرتبہ انھیں روک دیا۔

البتہ اس دوران مختلف جھڑپیں بھی ہوئیں، کوشش یہ تھی کہ جنگ مزید نہ پھیلے۔ بالآخر ذی الحجہ ۳۷ھ، میں جنگ شروع ہوئی اور محرم الحرام کے احترام میں جنگ بند رہی، اس دوران امامؑ نے پھر خطوط لکھے اور اپنے نمائندوں کو بھیجا۔ محرم الحرام ختم ہوتے ہی جنگ شدت کے ساتھ دوبارہ شروع ہوگئی، ۸ صفر کی تاریخ ایسی تھی کہ ہر طرف گھمسان کی لڑائی ہونے لگی جو رات تک جاری رہی، دس صفر کی صبح دونوں نمازوں کے بعد دونوں طرف کی فوجوں میں سخت جنگ ہوئی۔

لشکر امامؑ پیش قدمی کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا اور شامی افواج کو سخت مشکلات کا سامنا تھا، عجیب بات یہ ہے کہ صفر کے مہینے کی درمیانی رات کو جسے "لَيْلَةُ الْهَرِيرِ" کہتے ہیں (ہریر کے معنی کتوں کی طرح آواز نکالنا ہے۔ امیر شام کے فوجی امامؑ کے لشکر کے حملوں کی وجہ سے کتوں جیسی آوازیں نکال رہے تھے) جنگ جاری رہی، جب شامی افواج کو مکمل تباہی اور شکست نظر آئی، تو عمرو بن عاص نے، جو دھوکے اور فریب میں مشہور تھا، امیر شام کے حکم پر شکست سے بچنے کی راہیں سوچنا شروع کیں۔ پھر فوج کو حکم دیا کہ قرآن کو نیزوں پر بلند کر دیں، کیوں کہ ہم قرآن کے ماننے والے ہیں اور ہم قرآن کو حاکم قرار دیتے ہیں۔ امامؑ کے لشکر میں موجود منافقوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور لوگوں سے کہا، جنگ روک دو! ہم قرآن سے جنگ نہیں کریں گے اور اس حساس موقع پر لوگوں کو جنگ بند کر دی کرنے کی طرف دعوت دی۔ ایک بڑی تعداد دھوکے میں آ گئی اور امامؑ سے اس حکمیت کو قبول کرنے کا تقاضا کیا۔ مسئلہ حکمیت، ایک دھوکا اور فریب تھا، جو امامؑ پر مسلط کیا گیا، اس خطرناک دھوکے سے تلخ نتیجہ سامنے آیا۔ عمرو بن عاص اور امیر شام کی طرف سے جبکہ ابوموسیٰ اشعری کو جو سادہ لوح انسان تھے، مولا علیؑ کی طرف سے حکم بنایا گیا، عمرو بن عاص نے ابوموسیٰ اشعری کو بھی دھوکا دیا جس پر ابوموسیٰ اشعری نے کہا: علی اور امیر شام دونوں کو خلافت سے علیحدہ کر دیا جائے، عمرو بن عاص نے کھڑے ہو کر کہا: میں علیؑ کو خلافت سے علیحدہ کرتا ہوں اور امیر شام کو خلافت پر نصب کرتا ہوں۔

بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ حضرت علیؑ کے لشکر کو جو حکمین کے جواب سے قبل کوفہ پہنچ چکا تھا اور حکمین کے جواب کا منتظر تھا، جب ابوموسیٰ کے دھوکا کھانے کا انہیں علم ہوا تو انہیں ہوش آیا، مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا اور وقت گزر چکا تھا ایک مرکز پر جمع کر کے دوبارہ حملہ کرنا آسان کام نہ تھا۔[1] یہ ایسی کامیابی ہوتی جس کے نتیجے میں تاریخ اسلام میں ایک اہم تبدیلی رونما ہو جاتی اور مسلمان ہمیشہ کے لیے بنی امیہ کے شر سے محفوظ ہو جاتے، شرک و بت پرستی کی باقیات ختم ہو

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۲ صفحہ ۲۵۹

جاتیں، لیکن اب اس کا موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

اس کا پہلا اصل سبب: دشمن کی دھوکا دہی، دوسرا سبب: دوستوں کی سادہ لوحی جبکہ منافق اس انتظار میں تھے کہ ایسا موقع ہاتھ لگے اور وہ اس سے فائدہ اٹھائیں، تیسرا عامل: اختلاف وتفرقہ اور چوتھا عامل: مولا علیؑ کے لشکر میں نظم کا نہ ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

جنگ نہروان

خوارج جنگ صفین میں اور حکمیت کے معاملے میں آشکار ہو گئے، یہ اس تباہ کن جنگ کا نتیجہ تھا۔ وہ گروہ جس نے حکمیت کو قبول کیا تھا، بعد میں پشیمان ہوئے اور حکمیت کو قرآن کے خلاف اور کفر کہنے لگے اور ان کی بے غیرتی کی انتہا ہو گئی کہ انھوں نے امامؑ سے مطالبہ کیا کہ وہ توبہ کریں، ورنہ ان کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے، امام علی علیہ السلام جو اپنے لشکر میں سخت اختلافات دیکھ رہے تھے (کہ منافق اس اختلاف کو ہوا دے رہے ہیں) فوج کو حکم دیا کہ کوفہ کی طرف پلٹ جائیں، کوفہ میں بارہ ہزار افراد وہ تھے جو انتہائی متعصب اور لشکر سے جدا ہو گئے تھے اور مقام حرور یہ جو کوفہ سے دو میل کے فاصلے پر تھا، وہاں چلے گئے۔ اس وجہ سے یہ خوارج حرور یہ کہلانے لگے۔ مقام نہروان جو حرور یہ کے قریب ہے، اس مقام پر امامؑ سے جنگ کے لیے تیاری کرنے لگے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان میں کچھ وہ افراد بھی تھے جو امام علیہ السلام کے دیرینہ ساتھی تھے۔

ان میں وہ افراد بھی تھے جن کی پیشانی پر عبادت کی وجہ سے نشانات تھے، قرآن کی تلاوت کی آواز ہر جگہ آتی تھی۔ دراصل یہ وہ احمق عابد تھے جو افراط کا شکار تھے، ظاہراً دین سے منسلک تھے، لیکن حقیقت میں دین سے بے خبر تھے، لہٰذا ان کو مارقین کہتے ہیں۔ جب دونوں لشکر مدمقابل ہو گئے تو امامؑ نے خطاب فرمایا، جس پر مخالف کے لشکر کا ایک بڑا حصہ ان سے جُدا ہو گیا اور "اَلتَّوْبَةَ اَلتَّوْبَةَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ" کی آوازیں بلند کرتے ہوئے امامؑ سے معافی مانگنے لگے اور آپؑ نے انہیں بخش دیا۔ اس طرح ان بارہ ہزار افراد میں سے آٹھ ہزار افراد پلٹ آئے (روایت کے مطابق امامؑ نے ایک طرف پرچم نصب کر دیا اور توابین سے کہا کہ اس کے نیچے جمع ہو جائیں) جب باقی افراد سے امامؑ ناامید ہو گئے کہ یہ اب قابلِ ہدایت نہیں رہے اور جنگ کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تو امامؑ نے فرمایا: جنگ میں پہل نہ کی جائے، جمل وصفین کی طرح یہاں بھی آپؑ جنگ شروع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ خوارج نے حملہ کیا اور امامؑ کے لشکر نے سخت ردعمل دکھایا اور اپنا دفاع کیا۔ خوارج کے تمام افراد (جن کی تعداد چار ہزار تھی) قتل ہوئے سوائے ان نو (۹) افراد کے جو بھاگ گئے اور امامؑ کی فوج کے ۹ افراد سے زیادہ شہید نہیں ہوئے۔ امامؑ کا یہ سچا کلام جو آپؑ نے جنگ سے قبل ارشاد فرمایا تھا کہ (ان میں دس سے

زیادہ باقی نہیں رہیں گے اور تم میں سے دس سے زیادہ شہید نہیں ہوں گے، یہاں واضح و آشکار ہو گیا۔ [۱]

یہ جنگ ۹ صفر ۳۸ھ یا ۳۹ھ کو ہوئی اور یہ جنگ ایک گھنٹہ سے زیادہ طولانی نہیں تھی۔ [۲]

پانچواں حصہ

اَمَا وَ الَّذِی فَلَقَ الْحَبَّةَ وَ بَرَاَ النَّسَمَةَ لَوْ لَا حُضُورُ الْحَاضِرِ وَ قِيَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُودِ النَّاصِرِ وَ مَا اَخَذَ اللّٰهُ عَلَى الْعُلَمَاءِ اَلَّا يُقَارُّوا عَلَى كِظَّةِ ظَالِمٍ وَ لَا سَغَبِ مَظْلُومٍ لَاَلْقَيْتُ حَبْلَهَا عَلَى غَارِبِهَا وَ لَسَقَيْتُ آخِرَهَا بِكَاْسِ اَوَّلِهَا وَ لَاَلْفَيْتُمْ دُنْيَاكُمْ هٰذِهٖ اَزْهَدَ عِنْدِی مِنْ عَفْطَةِ عَنْزٍ.

''آگاہ ہو جاؤ! وہ خدا گواہ ہے جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور ذی روح کو پیدا کیا اگر حاضرین کی موجودگی اور انصار کے وجود سے حجت تمام نہ ہو گئی ہوتی اور اللہ کا اہلِ علم سے یہ عہد نہ ہوتا کہ خبردار ظالم کی شکم پری اور مظلوم کی بھوک و پیاس پر چین سے نہ بیٹھنا، تو میں آج بھی اس خلافت کی رسی کو اسی کی گردن پر ڈال کر ہنکا دیتا اور اس کے آخر کو اوّل ہی کے پیالے سے سیراب کرتا اور تم دیکھ لیتے کہ تمہاری دنیا میری نظر میں بکری کی چھینک سے بھی زیادہ بے قیمت ہے۔''

شرح و تفسیر

میں نے خلافت اور بیعت کیوں قبول کیا؟

خطبے کے اس حصے میں آپؑ نے بیعت قبول کرنے کی وجوہات واضح طور پر بیان کی ہیں اور اس کی قبولیت کے اہداف و مقاصد انتہائی مختصر جملوں میں بیان فرمائے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ اگر یہ بڑے مقاصد مدنظر نہ ہوتے تو میں لوگوں پر حکمرانی کرنے کے لیے ذرا بھی اہمیت کا قائل نہیں تھا۔ آپؑ فرماتے ہیں:

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۹

[۲] کامل ابن اثیر، جلد ۳، شرح خوئی، نہج البلاغہ، طبری، جلد ۴، فروغ ولایت، مروج الذھب، جلد ۲ (خلاصہ کے ساتھ)۔

"اَما وَالَّذِیْ فَلَقَ الْحَبَّةَ،وبَرَءَ النَّسَمَةَ[۱] لَوْلَا حُضُوْرُ الْحَاضِرِ[۲] وَ قِیَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُوْدِ النَّاصِرِ، وَ مَا اَخَذَ اللهُ عَلَی الْعُلَمَاءِ اَنْ لَا یُقَارُّوْا[۳] عَلٰی کِظَّةِ[۴] ظَالِمٍ، وَلَا سَغَبِ[۵] مَظْلُوْمٍ لَاَلْقَیْتُ حَبْلَهَا عَلٰی غَارِبِهَا[۶] وَلَسَقَیْتُ آخِرَهَا بِکَأْسِ اَوَّلِهَا"

''دیکھو اُس ذات کی قسم! جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور انسان کو خلق کیا، اگر بیعت کرنے والوں کے ہجوم کی موجودگی اور مدد کرنے والوں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہوگئی ہوتی اور وہ عہد و وعدہ جو اللہ نے ہر امت کے علما سے لے رکھا ہے کہ وہ ظالم کی شکم پُری اور مظلوم کی بھوک و پیاس پر سکون و قرار سے نہ بیٹھیں تو میں خلافت کے اونٹ کی باگ ڈور کو اس کی پشت پر ڈال دیتا (اور اُسے چھوڑ دیتا) اور اس کے آخر کو اس پیالے سے سیراب کرتا جس پیالے سے پہلے کو سیراب کیا تھا۔''

یہ جملہ حقیقت میں اُس تعریف اور توصیف کی طرف اشارہ ہے، جو قرآن مجید میں خداوند متعال نے اپنے لیے کی ہے، خدا فرماتا ہے:

"فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی"[۷]

''خداوند متعال دانے اور گٹھلی کو شگافتہ کرنے والا ہے۔''

یہ مطلب حقیقت میں پروردگار کی خلقت کی اہم ترین قسم یعنی زندگی اور حیات کی خلقت کی طرف اشارہ ہے اور "وبَرَءَ النَّسَمَةَ" اس جملے میں انسان کی روح کی خلقت کا بیان ہے، جو بہت عظیم خلقت ہے۔ قرآن مجید میں اس کے ذکر

---

[۱] نسمہ، اصل میں ہلکی ہوا چلنے کے معنیٰ آتا ہے، کبھی سانس لینے کے معنیٰ میں آتا ہے یا خود انسان کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور مندرجہ بالا کلام میں اس لفظ کے معنیٰ وہی انسان یا روح کے معنیٰ ہیں۔

[۲] حاضر، کوئی شخص یا کوئی چیز موجود ہو تو کہا جاتا ہے۔ اہلِ زبان کے کہنے کے مطابق کبھی یہ لفظ بڑے قبیلے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مذکورہ کلام میں دونوں معنیٰ مراد ہو سکتے ہیں۔

[۳] لا یقاروا، قرار کے مادّہ سے معنیٰ سکون اور آرام ہونے کے ہیں لہٰذا جملے کے معنیٰ ہیں خاموش نہ رہیں آرام سے نہ بیٹھیں۔

[۴] کظۃ، کے معنیٰ وہ بُری حالت ہے جو زیادہ کھانے کی وجہ سے انسان کو درپیش ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا جملے میں امامؑ کی مراد دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا اور دوسروں پر ظلم و زیادتی کرنا ہے۔

[۵] سغب، اصل میں بھوک کے معنیٰ ہیں اسی لیے قحط والے سالوں کو ''ذو مسغبۃ'' کہا جاتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیت ہے "او اطعام فی یوم ذی مسغبۃ"۔ امامؑ کے کلام میں مظلوموں کے حقوق کو ضائع کرنے سے متعلق کنایہ ہے۔

[۶] غارب، اونٹ کی گردن سے لے کر کوہان تک کے درمیانی حصے کو کہا جاتا ہے جب اونٹ کو آزاد کرنا ہو تو عام طور پر اس کی باگ ڈور اُس جگہ اس کی پشت پر ڈال دی جاتی ہے۔

[۷] سورۂ انعام، آیت ۹۵

کے بعد کہا گیا ہے:

"تَبَارَكَ اللهُ اَحسَنُ الْخَالِقِيْنَ"۔[۱]

یہاں پر امامؑ نے خدا کی اہم ترین خلقت کی قسم کھائی ہے اور یہ قسم اس مطلب کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے جس کے لیے یہ قسم کھائی جارہی ہے۔

"لَوْلَا حُضُوْرُ الْحَاضِرِ" یہ جملہ ظاہراً آپؑ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے افراد کی حاضری کی طرف اشارہ ہے۔ اگرچہ بعض شارحین نے خود بیعت کی طرف اشارہ قرار دیا ہے۔ دونوں صورتوں میں معنی میں زیادہ فرق نہیں پڑتا ہے، لیکن اس جملے سے یہ احتمال ہے کہ اس سے مراد خدا کے حضور یا پیغمبرؐ کے زمانے میں حاضر ہونا، جس زمانے میں امام علیؑ کے لیے پیشین گوئی کی تھی۔ یہ سب احتمال بعید ہیں اگرچہ بعض بڑے علما نے اس معنی کو بھی احتمال کے طور پر ذکر کیا ہے۔

بہرصورت مذکورہ جملہ اور "وَ قِيَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُوْدِ النَّاصِرِ" کا جملہ ان دونوں کے ایک ہی معنی ہیں اور دونوں جملے آپؑ پر حجت تمام ہونے کی طرف اشارہ ہیں۔ اتنے سارے مدد کرنے والوں اور بیعت کرنے والوں کی موجودگی میں آپؑ پر ضروری تھا کہ عدالت کے نفاذ کے لیے قیام کریں۔

"اَلْقَيْتُ حَبْلَهَا عَلٰى غَارِبِهَا" یہ جملہ کسی چیز سے صرفِ نظر کرنے کے معنی میں آتا ہے، کیونکہ اونٹ سے اگر کوئی سروکار نہ ہو تو اس کی باگ دوڑ اس کی پشت پر ڈال دی جاتی ہے اور اس کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔

"وَلَسَقَيْتُ آخِرَهَا بِكَأْسِ اَوَّلِهَا"

''جس پیالے سے اوّل کو سیراب کیا تھا اُسی سے آخر کو سیراب کرتا۔''[۲]

یہ جملہ کنایہ ہے اس بات کی طرف کہ جس طرح میں نے پہلے تین خلفا کے دور میں صبر وتحمل سے کام لیا تھا، بعد میں بھی ایسا کرتا رہوں گا۔

لیکن دو دلائل کی بنا پر میں بیعت قبول کرنے اور قیام کرنے پر مجبور ہوا، کیونکہ ایک طرف اتنے سارے مدد کرنے والوں کا جمع ہونا میرے اوپر حجت تمام ہونے کا سبب بن گیا، دوسری طرف خدا نے ہر قوم کے علما سے عہد و پیمان لیا ہے کہ وہ جب معاشرے میں ظلم و زیادتی دیکھیں یہاں تک کہ ظالم حد سے زیادہ کھانے کی وجہ سے بیمار ہو گئے ہوں اور مظلوم افراد

---

[۱] سورۂ مومنون، آیت ۱۴

[۲] امامؑ کے اس کلام کے لیے گواہ کے طور پر وہ شعر ہے، جو آپؑ نے اُس وقت فرمایا: جب طلحہ وزبیر نے آپؑ کی مخالفت شروع کی اور جنگ جمل کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ "فِتَنٌ تَحُلُّ بِهِمْ وَهُنَّ شَوَارِعُ تَسْقِيْ اَوَاخِرَهَا بِكَأْسِ الْاَوَّلِ"

بھوکے پیاسے ہوں تو ایسی صورت حال میں خاموش نہیں رہنا چاہیے، بلکہ اس کے لیے قیام کرنا ضروری ہے، تاکہ ظالموں کے ہاتھ کاٹ دیں اور مظلوموں کو رہائی دلا دیں اور خدا کی عدالت معاشرے میں نافذ کریں۔

امامؑ کا یہ کلام تنبیہہ ہے ہر امت کے علما و دانشوروں کو جب دینی حکومت تشکیل دینے کے لیے حالات مناسب ہوں اور خدائی عدالت کا نفاذ کر سکتے ہوں، تو اس وقت ان کی خاموشی جرم ہے۔ (خاموشی توڑ کر قیام کرنا چاہیے) معاشرے میں الٰہی عدالت کو نافذ کریں اور خدا کے فرمان کے نفاذ کے لیے ظالمین کے ساتھ مقابلہ شروع کرنا چاہیے۔ وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ صرف کچھ واجبات مثل نماز و روزہ و حج وغیرہ انجام دے کر نیز کچھ مستحبات بجالا کر اپنی ذمے داریوں پر عمل کر چکے ہیں وہ انتہائی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ معاشرے میں عدالت کا نفاذ اور ظلم و ظالمین سے مقابلہ کرنا اور مظلوموں کی حمایت کرنا بھی ان کی اسلامی ذمے داریوں میں شامل ہے۔

بالآخر امام علیہ السلام اس معرکۃ الآرا سیاسی اور معاشرتی خطبے کے آخری جملوں میں فرماتے ہیں:

"وَلَوْلَا حُضُورُ الْحَاضِرِ وَقِيَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُودِ النَّاصِرِ وَمَا أَخَذَ اللَّهُ عَلَى الْعُلَمَاءِ أَنْ لَا يُقَارُّوا عَلَى كِظَّةِ ظَالِمٍ وَلَا سَغَبِ مَظْلُومٍ لَأَلْقَيْتُ حَبْلَهَا عَلَى غَارِبِهَا وَلَسَقَيْتُ آخِرَهَا بِكَأْسِ أَوَّلِهَا وَلَأَلْفَيْتُمْ دُنْيَاكُمْ هَذِهِ أَزْهَدَ عِنْدِي مِنْ عَفْطَةِ عَنْزٍ"

(ہاں اگر مذکورہ بالا دلائل نہ ہوتے تو) میں ہرگز بیعت قبول نہ کرتا، اس وقت تم سمجھ جاتے کہ دنیا کی قیمت اس کی تمام تر شان و شوکت اور زرق برق کے ساتھ میری نظر میں بکری کی چھینک سے کمتر ہے۔

اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ "عَفْطَةِ"، صحاح اللغۃ کے مطابق وہ ہی پانی ہے جو بھیڑ یا بکری چھینکنے کے دوران اطراف میں پھینکتی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس مادّی دنیا کی تمام آب و تاب و اہمیت و عظمت دنیاداروں کی نظر میں ہے، امیر المومنینؑ کے نزدیک یہ کتنی حقیر و ناچیز ہے، حقیقت میں خود ایک بھیڑ یا بکری کی کیا قیمت ہوتی ہے، کہ اس کی ناک سے پھینکے ہوئے پانی کی کوئی قیمت ہو، بلکہ یہ ایک گندی چیز ہے۔ یقینی طور پر یہ کلام ان لوگوں کے لیے جو حضرت علیؑ کی روحانی کیفیت سے آگاہ نہیں ہیں، بہت تعجب کی بات ہے، لیکن جو اُن کی معنوی دنیا اور اُن کے عرفانی مراتب سے باخبر ہو جائے، تو دیکھے گا کہ اس کلام میں ذرا سی بھی مبالغہ آرائی نہیں ہے۔

سیّد رضیؒ اس خطبے کے ذیل میں کہتے ہیں:

---

[1] الفیتم، الفیٰ کے مادّے سے ہے۔ کسی چیز کا حصول اور پانا مراد ہے۔

[2] عطفہ، اصل میں مقائیس اللغۃ کے کہنے کے مطابق ہلکی آواز کو کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے بھیڑ یا بکری کی چھینک کو، عطفۃ، کہتے ہیں۔ مذکورہ کلام میں مراد ناک کے پانی کے وہ ذرّات ہیں جو چھینک کے دوران پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ یہ وہی تفسیر ہے جو مقائیس اللغۃ میں آئی ہے، لیکن دوسرے بعض اہل زبان نے حیوان سے نکلنے والی کچھ دوسری آوازوں کو بھی عطفۃ کہا ہے۔

[3] عنز، کے معنی بکری کے ہیں۔